مٹی سے عشق
علیم الحق حقی
PDFBOOKSFREE.PK

بسم الله الرحمن الرحيم

مٹی سے عشق

علیم الحق حقی

34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7352332-7232336

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب .... مٹی سے عشق

مصنف .... علیم الحق حقی

ناشر .... گل فراز احمد

علم وعرفان پبلشرز، لاہور

مطبع .... زاہدہ نوید پرنٹرز لاہور

سنِ اشاعت .... نومبر 2006ء

تعداد 500

قیمت .... -/100 روپے

علم وعرفان پبلشرز

34- اُردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40- اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

مٹّی سے عشق

جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ بارشوں کے راستے کو اور خراب کر دیا تھا۔ کہیں گاڑیوں کے پہیوں نے آٹھ آٹھ دس دس انچ گڑھے بنا دیے تھے، جو لکیر کی طرح راستے پر چلے آ رہے تھے اور کہیں اسی عمل کے نتیجے میں کچی مٹی نے جمع ہو کر منڈیری سی بنا دی تھی۔ اس وجہ سے ڈرائیو کرنے میں اور دشواری ہو رہی تھی۔ راستہ ویسے ہی کم خطرناک نہیں تھا۔ ایک طرف پہاڑی دیوار تھی اور دوسری طرف کھائی۔ اور بعض چڑھائیاں تقریباً عمودی تھیں۔

جیپ کے تمام شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اندر خاموشی تھی۔ دونوں مسافر اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن ان کے درمیان ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا تعلق تھا۔ ایک زندگی میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا اور دوسرا زندگی کے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔

سردی بہت زیادہ تھی۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ بچے نے اپنی جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ اس کے باوجود اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ ”پاپا۔ ہیٹر چلا دیں نا“ وہ منمنایا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے باپ نے ایک لمحے کو کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ ”بیٹے...... تمہیں ہیٹر کی مدد کے بغیر سردی سے جیتنا ہوگا۔ ورنہ یہاں کیسے رہو گے؟“

”مگر پاپا...... بہت سردی لگ رہی ہے۔“

”ابھی اس کا علاج کرتے ہیں۔“ نعمان شاہ نے کہا اور موڑ کاٹنے کے بعد پہاڑی دیوار کے پہلو سے لگا کر جیپ روک دی۔ ”چلو نیچے اترتے ہیں۔“ اس نے بچے سے کہا۔ ”تم یہاں شُو شُو بھی کر لینا۔“

دونوں نیچے اتر آئے۔ بچے کے جسم کی تھرتھری اور بڑھ گئی۔ نعمان شاہ اسے پُرتشویش نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں برانڈی کی وہ بوتل کھولنی نہ پڑ جائے، جو وہ احتیاطاً ساتھ لایا تھا۔ اب سے پہلے اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی نوبت آئے گی۔

بچہ پہاڑی دیوار کے ساتھ حاجت رفع کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ نعمان اپنے اکلوتے بچے کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ دبلا پتلا، بے حد خوبصورت بچہ تھا۔ اس کے نقوش بے حد نازک اور کھڑے کھڑے تھے۔ جسمانی طور پر تو تھا ہی، لیکن طبعاً بھی وہ نازک تھا۔ نعمان سوچ رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود میں اسے سختیوں سے گزارنے کے لیے یہاں لے آیا ہوں۔ کہیں یہ...... خدانخواستہ یہ اس کے لیے...... اس سے زیادہ اُس سے سوچا نہیں گیا۔

نعمان شاہ چالیس سال کا ہونے والا تھا۔ وہ کسرتی جسم کا مالک، بے حد وجیہہ اور خوش رُو مرد تھا۔ دو سال پہلے اس کی بیوی اور ننھے عمران کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس وقت عمران دو سال کا تھا۔ تب یہ سے بیٹا ہی اس کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔ بیٹا ابتدا ہی سے اس سے بہت زیادہ مانوس تھا۔ اس نے ماں کو یاد بھی بہت کیا اور اس کی کمی بھی محسوس کرتا رہا لیکن اللہ نے خاص کرم فرمایا۔ ماں کا غم بچے کے لیے دل کا روگ نہ بنا۔ ورنہ زیادہ تر بچے اس حادثے کو دل کا روگ بنا لیتے ہیں۔

عمران رفع حاجت کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے جسم کی تھرتھری کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔ تاہم اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے ہوئے تھے۔ نعمان شاہ نے جیپ کا دروازہ کھولا اور گلووز کمپارٹمنٹ میں سے چمڑے کے دستانے نکال لایا۔ ''لو...... یہ پہن لو۔'' اس نے بیٹے کی طرف دستانے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ننھے عمران نے دستانے پہن لیے، پھر وہ دونوں کھائی کے کنارے کھڑے ہو کر نیچے دیکھتے رہے۔ ہر طرف زمین کی رنگت براؤن تھی۔ یوکلپٹس کے درختوں سے سوا تمام درخت ٹُنڈ مُنڈ کھڑے تھے۔ اس پورے منظر میں کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر وہ بے حد حسین لگ رہا تھا۔ اس منظر نے نعمان کا اعتماد بحال کر دیا۔ اس نے سوچا...... میرا بیٹا نہ صرف یہاں خیریت سے رہے گا بلکہ مضبوطی بھی پکڑے گا۔ یہ اس کی اپنی زمین ہے۔ اور پودے اپنی زمین میں خوب پنپتے ہیں۔

''کیسا لگ رہا ہے بیٹے؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت بڑا بڑا لگ رہا ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے پاپا۔'' بچے نے سادگی سے بڑی بات کہہ دی۔

نعمان مسکرا دیا۔ ہزار گز کا بنگلا اور پڑوسیوں کے ہزار گز کے بنگلوں کی قطار دنیا کے پھیلاؤ اور وسعت کی مظہر تو نہیں ہو سکتی۔

بچے کی نظر کھائی سے اٹھی اور سامنے والے پہاڑ پر جا رکی۔ اس کی آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے سر گھمایا اور باپ کو دیکھا۔ ''پاپا...... آئی لَو یُو سو ویری مچ۔''

نعمان کا دل خوشی سے بھر گیا۔ قسمت سے بچے کو گورنس بہت اچھی ملی تھی۔ اس نے کھیل کھیل میں بچے کو کافی کچھ سکھا دیا تھا۔ اچھا خاص پڑھا دیا تھا۔ اس نے بچے کی آنکھوں میں دیکھا۔ بچہ متوقع نظروں

سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''بیٹے...... میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم حساب نہیں لگا سکتے۔ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''تو پھر مجھے دور کیوں کر رہے ہیں خود سے۔ اتنی دور کیوں لے آئے ہیں مجھے؟'' بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

اتنی دور کہتے ہوئے بچے کے لہجے میں لاکھوں میل دور کا سا تاثر تھا۔ نعمان مسکرا دیا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ اسی لیے وہ اپنے بچے کو بے آرامی کے ساتھ کراچی سے یہاں تک جیپ میں لے کر آیا تھا۔ اس سفر میں عمران نے بہت کچھ دیکھا...... بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ بچوں کا مشاہدہ تو ویسے بھی غضب کا ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ننھے عمران نے اس سفر کو اپنے بہت اندر...... بہت گہرائی میں محسوس بھی کیا تھا اور محفوظ بھی۔ اس نے ایک سفر میں ایک شہر کی حدود ختم ہوتے، غیر آباد علاقہ شروع ہوتے اور پھر دوسرے شہر کی حدود شروع ہوتے اتنی بار دیکھا تھا کہ اسے گنتی بھی یاد نہیں رہی تھی۔ اس نے موسم بدلتے دیکھے تھے۔ زبانیں، بولیاں بدلتے دیکھی تھیں۔ پہلے وہ پیشاب روکتا رہا۔ وہ تو منتظر رہا کہ کوئی شہر آئے اور پاپا کسی ہوٹل کے باہر گاڑی روکیں تو وہ فارغ ہو مگر کسی ہوٹل کا باتھ روم بھی گھر کے باتھ روم جیسا نہیں تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب اس نے حاجت سے مجبور ہو کر پاپا سے گاڑی روکنے کو کہا۔ پہلی بار کھیت کے کنارے بیٹھ کر پیشاب کرنا اسے عجیب لگا مگر اب اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔ وہ بہت آگے نکل آیا تھا۔

''پاپا...... آپ نے جواب نہیں دیا۔'' اُس نے باپ کو یاد دلایا۔ ''آپ تو میرے بغیر سوتے بھی نہیں۔ آپ کہتے تھے...... صبح کو تمہیں پیار نہ کروں تو میری صبح نہیں ہوتی۔''

''یہ سچ ہے بیٹے'' نعمان نے آہ بھر کے کہا ''اسی سے اندازہ لگا لو کہ میں تمہیں خود سے دور کر کے کتنی بڑی قربانی دے رہا ہوں اور اس میں تمہاری کتنی بہتری ہوگی...... اور میری بھی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا پاپا۔''

نعمان شاہ جانتا تھا کہ وہ جو باتیں کر رہا ہے، چار سالہ عمران کے ننھے سے ذہن کے لیے بہت بڑی ہیں۔ لیکن وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ بچوں کے ننھے ذہن ابتدا ہی سے ٹیپ کی طرح ہوتے ہیں۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے، اسے ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ پھر وہی ریکارڈ کی ہوئی باتیں ان کے لیے ترغیب اور ہدایت ثابت ہوتی ہیں۔ وہ غیر شعوری طور پر ان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا بچوں سے غیر اہم نہیں، اہم باتیں کرنی چاہییں۔

''اس میں تمہاری بہتری بھی ہے اور میری بھی۔'' اُس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارا ایسے کہ تمہارا فرض ہے کہ ویسے بنو، جیسا میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے بھی کہ میں تمہارا پاپا ہوں اور اس لیے بھی کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ کچھ توقف

کے بعد اس نے کہا۔ ''میری بہتری یہ ایسے ہے کہ تم یہاں مجھ سے دور رہو اور دیکھو کہ تمہارا باپ کیا ہے، کیسا ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہیں اور کیا برائیاں ہیں۔ وہ کن لوگوں کی اولاد ہے۔ اس لیے کہ تم بھی انہی لوگوں کی اولاد ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اندھا دھند مجھ سے محبت نہ کرو۔ ایسی محبت کوئی برائی، کوئی خامی سامنے آنے پر کم ہو جاتی ہے، ختم بھی ہو سکتی ہے۔ سو تم مجھے جان کر، مجھے سمجھ کر محبت کرو تا کہ دیرپا ہو۔''

بچہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ ثقیل گفتگو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن کوئی نامعلوم حس اسے یہ بتا رہی تھی کہ یہ بہت اہم باتیں ہیں۔ پاپا اکثر ایسی باتیں کرتے تھے، جو سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ تب وہ سوچتا تھا کہ وہ ان باتوں کو یاد رکھے گا اور بڑا ہو کر سمجھے گا۔ اس نے سر اٹھا کر پاپا کو دیکھا۔ وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ''پاپا...... آپ مجھے کیسا دیکھنا چاہتے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''تم اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ نہ موسم سے، نہ کسی آفت سے اور نہ انسانوں سے۔ ظالم کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہو سکو اور مظلوم کے کام آ سکو۔ تم ذہن سے بھی کام لو اور جسم سے بھی۔ سب کچھ سمجھ سکو اور مشقت بھی کر سکو۔''

''ٹھیک ہے پاپا، لیکن یہ سب کچھ میں گھر رہ کر بھی بن سکتا تھا...... آپ کے سامنے۔ یہاں کیوں لائے ہیں آپ مجھے؟''

نعمان شاہ نے سامنے والے پہاڑ کو دیکھا۔ شام کا جُھٹ پٹا تیزی سے اترتا آ رہا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا چار بجے تھے۔ دسمبر جنوری میں ان علاقوں میں مغرب پونے پانچ بجے ہو جاتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بیٹے...... اس سوال کا جواب میں تمہیں اوپر پہنچ کر دوں گا۔ تمہیں بتاؤں گا کہ اس زمین کی تمہارے لیے کیا اہمیت ہے۔ آؤ...... اب چلیں۔ رات اترنے والی ہے۔''

وہ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے۔ سفر پھر شروع ہو گیا۔

باہر کی فضا کے مقابلے میں جیپ کا ماحول کافی گرم تھا۔ ننھے عمران نے ستائشی نظروں سے اپنے باپ کو دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا...... پاپا کتنے عقل مند ہیں، سب کچھ جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ سردی کا علاج کریں گے...... اور انہوں نے کر دیا۔ جیپ اب غراتے ہوئے ایک تقریباً عمودی چڑھائی کو عبور کر رہی تھی۔ چڑھائی عبور کر کے اس نے موڑ کاٹا۔ سامنے مسطح زمین کا ایک قطعہ تھا۔ وہاں ایک کمرا سا بنا تھا۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ نعمان شاہ نے جیپ دروازے کے سامنے روکی، اترا، جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ پھر جیپ میں بیٹھا اور جیپ کو اندر لے گیا۔ جیپ سے اس نے بیگ اور سوٹ کیس نکالے اور عمران کے ساتھ باہر آ گیا۔ گیراج کا دروازہ اس نے پھر مقفل کر دیا۔ ''اب ہم پیدل چلیں گے بیٹے۔''

ایک بیگ اس نے کندھے سے لٹکایا۔ ایک بیگ ہاتھ میں اور دوسرا دوسرے ہاتھ میں لیا اور

پگڈنڈی کی طرف چل دیا۔ عمران اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ سامنے کے پہاڑوں پر بنے مکانوں کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب ان مکانوں میں روشنی بھی تھی۔

پگڈنڈی چڑھ کر وہ ایک اور مسطح قطعۂ زمین پر پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ سنگ مرمر کی بنی خوبصورت قبریں۔ تقریباً ہر قبر پر نرگس کے پھول کھلے تھے۔ نعمان شاہ نے بلند آواز سے السلام علیکم یا اہل قبور کہا اور فاتحہ پڑھنے لگا۔ ننھے عمران نے اس کی دیکھا دیکھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ فاتحہ خوانی کے بعد نعمان نے بیٹے کو ایک قبر دکھائی۔ ''یہ میری ماں کی قبر ہے۔ وہ تمہاری دادی تھیں۔ یہ میرے ابّو کی قبر ہے، تمہارے دادا...... اور یہ......''

''پاپا...... ممی کی قبر یہاں کیوں نہیں ہے؟'' عمران نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ قبریں بہت خوبصورت ہیں پاپا۔''

نعمان اس کا ہاتھ تھام کر ایک طرف لے آیا۔ ''اب میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔'' اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ یہ تمہاری اپنی زمین ہے۔ یہ پہاڑ دیکھ رہے ہو؟'' اُس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اور اس کے برابر والا پہاڑ، یہ تمہارے ہیں۔ اور بہت زمین ہے، جو تمہاری ہے۔''

ننھے عمران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''میرے ہیں؟''

''ہاں...... ویسے ہی جیسے یہ میرے ہیں۔ میرے ابو کے تھے اور ان کے ابو کے...... اور ان کے ابو کے ابو کے تھے۔ یہ ہمارا ورثہ ہے بیٹے۔ مگر صرف یہ زمین، یہ پہاڑ نہیں، ہمارا اصل ورثہ جہاد ہے۔ میرے دادا کے دادا کے دادا یہاں جہاد کے لیے آئے تھے......'' وہ کہتے کہتے رکا۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ وہ بتا رہا ہے، بچے کی فہم سے بالاتر ہے لیکن بتانا ضروری تھا۔ بچوں کو ابتدا ہی سے ان کے ملک کے محسنوں کے اور اجداد کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ ''ان کی آرزو شہادت کی تھی۔ بالاکوٹ میں سید شہید کی شہادت کے بعد وہ اس طرف نکل آئے۔ انہوں نے زمینیں خریدیں۔ کاشت کاری کی، لوگوں کو باعمل مسلمان بن کر دکھایا اور وہ عزت کمائی، جو ورثے میں منتقل ہوتی رہی۔ میں چاہتا ہوں، تم اس عزت کے لیے اہلیت حاصل کرو۔ تم یہاں رہو گے تو تمہیں اپنے بڑوں کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گا۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے سوچا۔ یہ سب کچھ اسے وقت پر معلوم ہو ہی جائے گا۔ ''آؤ بیٹے، اوپر چلیں۔'' اس نے بیٹے کا ہاتھ تھام کر کہا۔

☆☆☆☆☆

جمیلہ نے بھینسوں کے سامنے چارا ڈالا، پانی کے ناند بھرے اور پگڈنڈی سے اترتی اُس درخت کے نیچے آ بیٹھی، جو اسے بہت پسند تھا۔ اس وقت وہ درخت اس کے دل کی طرح ٹنڈ منڈ اور اداس معلوم ہو رہا

تھا۔اس درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ اُن لمحوں، اُن خوشیوں کے بارے میں سوچتی، جو ابھی تک اس کے حصے میں آئے ہی نہیں تھے۔ یہ سوچ کر وہ اداس ہو جاتی مگر پھر وہ خوشیاں، وہ لمحے جیتے جاگتے بن کر اس کے تصور میں تھر کنے لگتے۔ وہ سرشاری کے عالم میں بیٹھی ان سے کھیلتی رہتی۔ان سے محرومی پر اداس ہوتے ہوئے اسے کبھی یہ خیال نہ آتا کہ ابھی تو عمر کے اعتبار سے ان لمحوں، ان خوشیوں پر اس کا حق بھی نہیں۔ وہ صرف سولہ سال کی تھی لیکن محبت نے اس کی عمر بڑھا دی تھی۔ اسے پختگی عطا کر دی تھی۔ وہ حالِ دل کسی کو سنا بھی نہیں سکتی تھی۔ کون مانتا کہ پانچ سال پہلے وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی۔

وہ محبت تو شاید پہلی دید کے ساتھ اس کے دل میں بس گئی تھی۔ بس بچپن میں وہ اسے سمجھ نہیں سکتی تھی۔ سمجھ آئی تو وہ محبت بھی اُبھر آئی۔

اور اس محبت نے اسے اور جفاکش بنا دیا تھا۔ خالی بیٹھنا اسے راس ہی نہیں تھا۔ اس نے وقت سے پہلے ماں سے ہر کام لے لیا تھا اور پہاڑی گاؤں میں کام کم نہیں ہوتا۔ ماں نے بہت احتجاج کیا۔ باپ نے بہت شور مچایا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی جو تھی۔ اسی لیے تو انہوں نے اسے پانچ جماعت تک پڑھا بھی دیا تھا۔ خود جمیلہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن آگے پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ مسجد اسکول تو قریب ہی تھا، جہاں اس نے پانچ جماعتیں پڑھی تھیں مگر بڑا اسکول شہر میں تھا اور شہر بہت دور تھا۔ اکیلی لڑکی ہر روز اتنی دور جا آ نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی اس واجبی تعلیم سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کے پاس کھانا پکانے کی ترکیبوں کی درجنوں کتابیں تھیں۔ ان کی مدد سے وہ کھانا پکانے کے شہری فن میں طاق ہو چکی تھی۔ یہی حال سلائی کڑھائی کا تھا۔ اس نے صرف کتابوں کی مدد سے سب کچھ سیکھا تھا۔ اس کا ثبوت اس کا گھر تھا۔ بستر کی ہر چادر، میز پوش، کرسیوں کی گدیاں، دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے ...... سب اس کے سلیقے کے مظہر تھے۔ مگر یہ سب کچھ اس نے جس کے لیے کیا تھا، وہ اس عرصے میں ایک بار بھی گھر نہیں آیا تھا۔

وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے اٹھتی۔ بھینسوں کے چارے پانی کا اہتمام کرتی۔ مرغیوں کو کھول دیتی۔ بکریوں کے آگے بھی چارا ڈالتی۔ پھر وہ ناشتے کے لیے تندور میں روٹیاں لگاتی۔ اس کے بعد بیٹھ کر لسی بلوتی اور مکھن نکالتی۔ اتنی دیر میں بابا بھینسوں کا دودھ دوہ لیتا۔ وہ ناشتا کرتے۔

ناشتے کے بعد وہ باغوں کی طرف چلی جاتی۔ درختوں کی فاضل شاخیں چھانٹتی۔ کبھی وہ خودرو گھاس کاٹتی، جو بے ترتیبی سے ہر جگہ نہ صرف اگ آتی تھی بلکہ بڑھتی بھی تیزی سے تھی۔ کبھی وہ درختوں کو کھاد بھی دیتی۔ پھر وہ اس قطعے میں جاتی، جہاں اس نے سبزیاں بوئی ہوئی تھیں۔ وہاں سے نکلتی تو دوپہر ہو چکی ہوتی۔ وہ گھر جا کر کھانا کھاتی۔ دوپہر کا کھانا عام طور پر ماں ہی پکاتی تھی۔ صفائی بھی ماں کی ذمے داری تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ بکریوں کی طرف نکل جاتی، جنہیں اس نے صبح کھول دیا ہوتا تھا۔ بکریوں کا ساتھ اسے اچھا لگتا تھا۔ دھوپ میں کسی ٹنڈ منڈ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھتی اور

خوابوں میں گم ہو جاتی۔ سہ پہر میں وہ بکریوں کو گھر لے کر جاتی۔ پھر شام کے اور صبح کے لیے وہ چارا کاٹنے کی مشین کی مدد سے کُترا کرتی۔ یہ بہت تھکا دینے والا کام تھا۔ چھ بھینسوں کے لیے چارا کم نہیں ہوتا۔ بابا کو اس کا یہ کام اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اس کی ضد سے مجبور تھا۔ رات کا کھانا پکا کھا کر وہ بستر پر لیٹتی تو تھکن سے بدن چور ہوتا۔ تھکن اور اس پر الہڑ عمر کی نیند۔ لیٹنے کے بعد اسے ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔

موسمِ سرما اسے اسی لیے اچھا لگتا تھا۔ سوکھا چارا کاٹنے کی مشقت اور مصروفیت۔ دن اتنا چھوٹا ہوتا تھا کہ فرصت ہی نہیں ملتی تھی اور گرم بستر میں گھسنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں ہوتا تھا کہ نیند نہ آئے۔

موسمِ گرما کا معاملہ مختلف تھا۔ دن بڑے ہوتے تھے۔ بھینسیں سبز چارے کی طلب کرتی تھیں اور سوکھے چارے کو منہ بھی نہیں لگاتی تھیں۔ لہٰذا چارا کاٹنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بھینسوں کو بھی چرانے لے جاتی تھی اور اونچی سبز گھاس بھی کاٹ لاتی تھی۔ اس کے باوجود دن بڑا ہوتا تھا۔ کام اس کے مقابلے میں کم۔ لہٰذا فرصت بھی ہوتی تھی۔ اور اس میں وہ خواب دیکھ دیکھ کر تھک جاتی تو پھر اداس ہو جاتی۔ اول تو گرما میں اس کا دماغ اُڑا اُڑا رہتا تھا۔ اس لیے کہ انتظار رہتا تھا۔ اور یہ موسم اسے اسی لیے پسند بھی تھا کہ وہ ہمیشہ اسی موسم میں آتا تھا، جسے شہر میں سیزن کہا جاتا ہے۔ مگر چار موسم گرما ایسے گزرے کہ ہر سال آنے والا آیا ہی نہیں۔ وہ دعائیں کرتی رہتی کہ موسم گرما نہ جائے اور اس کے آنے کا امکان ختم نہ ہو مگر وقت کسی کے لیے کب رکتا ہے۔ ساون آتا تو دل میں پینگیں اٹھنے لگتیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہو جاتا۔ انتظار اور زور پکڑ جاتا۔ پھر بھادوں آتا اور جاتے جاتے سردی کی پہلی لہر لے آتا۔ پھر خزاں کا زرد موسم آ جاتا۔ درختوں کے نیچے سوکھے پتوں کے ڈھیر لگنے لگتے۔ جمیلہ کو لگتا کہ اس کا دل بھی ایک درخت ہے، جس کے نیچے سوکھے پتوں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آس ٹوٹنے لگتی۔ وہ پھر بھی آس کی ڈور تھامنے کی کوشش کرتی رہتی۔ آخر میں صرف ٹوٹی ہوئی ڈور کا ایک سرا ہاتھ میں رہ جاتا۔ اسے تسلیم کرنا پڑتا کہ اب وہ نہیں آئے گا۔

چار سال پہلے جب وہ آخری بار یہاں آیا تھا تو یہ وہ وقت تھا، جب جمیلہ کو احساس ہوا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ بلکہ نجانے کب سے کرتی ہے۔ اسی اوّلین لمحے میں اسے اُس پر بہت غصہ آیا تھا...... اس بات پر کہ اس نے شادی کیوں کر لی۔ صرف تین سال کا ہی تو فرق تھا۔ تین سال انتظار کر لیتا۔ پھر اسے خیال آیا...... کیسا انتظار۔ میں نے اسے کچھ بتایا ہی کب تھا۔ بہر حال اب تو بات سامنے آ گئی ہے۔ اسے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ اس کا محبوب شادی شدہ ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے درمیان مرتبے اور حیثیت کی دیوار بھی حائل ہے۔ اسے عمر کے فرق کی بھی پروا نہیں تھی۔ اس کے خیال میں تمام محبت کرنے والوں کی عمر ایک ہی ہوتی ہے۔ جیسے قیامت کے دن دنیا کے تمام انسان ایک ہی عمر کے اٹھائے جائیں گے۔ اسکے خیال میں کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں تھا۔ اسے بس اتنا کرنا تھا کہ دل کی بات اُس

سے کہہ دے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ ارادہ کرتی تھی مگر اس کے سامنے پہنچ کر حوصلہ ہار دیتی تھی۔ گنگ ہو جاتی تھی۔ اسی گومگو میں وقت گزر گیا۔ وہ چلا گیا اور اب تک آیا ہی نہیں۔

اب جمیلہ اپنی کم ہمتی کو کوستی تھی۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ اس بار وقت ضائع نہیں کرے گی۔ ایک بار وہ سامنے آ جائے اور اس خیال سے اس کا رواں رواں دستِ دعا بن جاتا تھا۔

نیچے سے کسی گاڑی کی آواز سن کر وہ چونکی۔ یقیناً یہ کوئی گاڑی تھی۔ وہ بھاگ کر اس طرف گئی، جہاں سے پہاڑ کے گرد چکر لگا کر اوپر آتی کچی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اس نے جھانکا۔ کافی نیچے ایک چڑھائی پر وہ جانی پہچانی جیپ ہانپتی کانپتی چڑھ رہی تھی۔

جمیلہ کا دل بلیّوں اچھلنے لگا۔ وہ وحشت زدہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی گھر کی طرف بھاگی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے تیز چھری لے کر مرغیوں کے ڈربے کی طرف گئی۔ ڈربے کا دروازہ کھول کر اس نے اندر ہاتھ ڈالا تو سب سے پہلے اس کی چہیتی چتکبری مرغی دروازے کی طرف لپکی۔ اسی لمحے اس کی ماں نے اسے پکارا۔ ”اری جمیلہ...... کیا بات ہے؟“

جمیلہ نے سر گھمائے بغیر کہا۔ ”ماں...... تو آتش دان چلا دے، انگیٹھیاں بھی دہکا لے۔ وہ آ رہے ہیں۔“

”کون آ رہے ہیں؟“

بڈھا رب نواز حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے حقے کی نے منہ سے نکال کر متجسس نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”نعمان صاحب آ رہے ہیں۔“ جمیلہ نے کہا۔

”کون نو......“ ماں پوچھتے پوچھتے رکی اور اچانک اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے شروع کر دیے۔ ”اری کم بخت، تیرا بڈھا بابا جسے شاہ جی بابا کہے، تو اس کا نام لیتی ہے۔ ہزار بار تجھے کہا ہے، پیروں کا نام نہ لیا کر۔“

”منہ سے نکل گیا تھا ماں۔ میں تو سرکار کہتی ہوں انہیں۔ تو جلدی سے آگ جلا ماں۔ اتنی سردی میں پہلی بار اِدھر آئے ہیں۔“

بڈھا رب نواز مسکرایا۔ ”تجھے اس کا ہوش کہاں۔ چھوٹے شاہ بابا جوان ہونے تک تو یہیں رہتے رہے ہیں۔“

جمیلہ نے سنی ان سنی کر دی اور مرغیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چتکبری تو سامنے ہی تھی۔ اسے پکڑتے ہوئے اس کا دل تھوڑا سا کانپا۔ یہ مرغی اسے بہت پیاری تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک ہاتھ میں چتکبری کو اور دوسرے ہاتھ میں ایک اور مرغی دبوچی اور انہیں باہر نکال کر ڈربے کا دروازہ بند کر دیا۔

مشہدی سیب کے درخت کے تھانولے میں چتکبری نے جیسے شور مچا کر فریاد کی اور اسے اس کی محبت یاد دلائی۔ ”اری تجھے کیا پتا، اُن پر تو میں تجھ جیسی لاکھوں قربان کر سکتی ہوں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ پھر اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔

گھر کی ساکت زندگی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سب تندہی سے کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ پھر بڈھا رب نواز گھر سے نکل آیا۔

☆☆☆☆☆

گھر کے سامنے میدان میں چھوٹے شاہ جی بابا نظر نہیں آئے۔ رب نواز پگڈنڈی سے اترنے لگا۔ وہ قبرستان سے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ چھوٹا سا ایک لڑکا بھی تھا۔ پیارا سا، ہو بہو ان جیسا۔ وہ جیکٹ پہنے تھا۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ رب نواز انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا۔

نعمان شاہ نے دونوں سوٹ کیس زمین پر رکھے اور رب نواز سے گلے ملا۔ پھر اس نے ہاتھ ملایا رب نواز نے اس کا ہاتھ تھام کر بڑے احترام سے لبوں سے لگایا۔

”عمران...... چاچا رب نواز سے ہاتھ ملاؤ۔“ نعمان نے بیٹے سے کہا۔

عمران نے شرمیلے پن سے رب نواز کو سلام کیا پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ رب نواز دیر تک اس کا ہاتھ چومتا رہا۔ وہ حیران کھڑا رہا۔ ”کیسے ہو نکے شاہ جی؟“ رب نواز نے پوچھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔“

رب نواز اس کے لب و لہجے کی شائستگی اور اس کے اعتماد سے بہت متاثر ہوا۔ ”ماشاءاللہ“ اُس نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ”کیوں نہ ہو، بڑے سرکاروں کی اولاد ہے۔“

نعمان نے سوٹ کیسوں کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے کہ رب نواز نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”گناہ گار کرتے ہو شاہ جی بابا۔ یہ بیگ بھی اتار دو۔ میں کس لیے ہوں آخر؟“

ایسے موقعوں پر نعمان شاہ شرمسار ہونے مگر ہتھیار ڈال دینے کا بہت پہلے عادی ہو چکا تھا۔ اس نے بیگ بھی کندھے سے اتار دیا۔ رب نواز نے تینوں چیزیں اٹھا لیں اور آگے آگے چلنے لگا۔ اوپر میدان میں پہنچ کر وہ مڑا اور ننھے عمران سے بولا۔ ”یہ کھیت تمہارا ہے نکے شاہ جی۔ یہ زمین، یہ پہاڑ بھی تمہارا ہے۔ ہم بھی تمہارے چاکر ہیں۔“

عمران نے کھیت کو دلچسپی سے دیکھا۔ گندم کے ننھے ننھے پودے زمین سے سر نکال چکے تھے۔ کھیت کے آگے ایک کچا مکان نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ اسی مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ننھے عمران کو مایوسی ہوئی۔ پاپا سے دور، اس مکان میں رہنا ہے اسے۔

وہ دروازے کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھی عورت باہر آ گئی۔ وہ بہت خوبصورت اور صحت مند تھی۔ صرف سفید بال ہی اس کے بڑھاپے کے گواہ تھے۔ اُس نے نعمان شاہ کو سلام کیا اور اس کا ہاتھ چوما۔

اس بار عمران نے بغیر کہے سلام کیا تھا۔ عورت نے سلام کا جواب دے کر اس کا ہاتھ بھی چوما۔ عمران کو وہ بہت اچھی لگی۔ بہت نرم، مہربان...... جیسے ماں۔

وہ گھر کے اندر گئے۔ بہت بڑا آنگن تھا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ درخت لگے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا۔ اس میں چارپائیاں پڑی تھیں۔ وہ لوگ برآمدے سے گزر کر ایک کمرے میں گئے۔ کمرے کو دیکھ کر عمران کو حیرت ہوئی۔ وہ اس گھر کا کمرا نہیں لگ رہا تھا۔ حیرت نعمان کو بھی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں وہ سیکڑوں بار آیا تھا لیکن یہ کمرا اتنا خوب صورت پہلے کبھی نہیں تھا۔ میزوں پر بہت نفیس کڑھائی والے میز پوش تھے۔ کمرے میں دو بستر تھے۔ ان پر خوبصورت چادریں تھیں۔ کڑھے ہوئے غلافوں والے تکیے تھے۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ہر چیز سے سلیقہ جھلک رہا تھا۔

''بیٹھیں شاہ جی بابا۔ بستر پر آرام سے بیٹھیں پاؤں پھیلا کر۔'' رب نواز نے کہا۔

''کیا بات کرتے ہو جی۔ عورت نے شوہر کو ٹوکا۔ ''میں نے گرم پانی رکھ دیا ہے۔ سرکار آپ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلیں۔ کھانا تیار ہے۔''

''ہاں...... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔'' رب نواز خجل ہو گیا۔ ''کلثوم ٹھیک کہہ رہی ہے شاہ جی۔ میں تو آپ سے بات کرنے کو ترس گیا تھا اس لیے......''

نعمان نے بیگ سے بیٹے کے لیے سمر کا ایک شلوار سوٹ نکالا اور اُس کے کپڑے تبدیل کرائے۔ جوتے اتارے لیکن موزے رہنے دیے۔ پھر اس نے اُس کے سلیپر نکالے۔ خود اس نے صرف جوتے اتار کر سلیپر پہنے۔ وہ شلوار قمیص پہنے تھا۔ لباس تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

کچے باتھ روم کو اندر سے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اندر پہنچ کر پہلا احساس یہ ہوتا تھا کہ جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا ہے۔ باتھ روم کی دیواروں اور چھت پر بہت خوبصورت پھولوں والا وال پیپر لگا تھا۔ بالٹی میں گرم پانی رکھا تھا۔ نعمان نے بیٹے کو کلیاں کرائیں اور اسکا منہ دھلایا۔ پھر خود بھی منہ دھویا۔ پلٹا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ باتھ روم کے دروازے پر ہاتھ میں تولیا لیے ایک بہت پیاری لڑکی کھڑی تھی۔ نعمان اسے پہچان نہ سکا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چار سال میں کوئی اتنا بدل سکتا ہے۔ لڑکی نے تولیا اس کی طرف بڑھایا۔ نعمان نے تولیا لے کر ہاتھ منہ پونچھا۔ عمران کا چہرہ لڑکی پہلے ہی خشک کر چکی تھی۔

نعمان نے تولیا لڑکی کو واپس دیا۔ لڑکی نے تولیا لے کر بے نیازی سے کندھے پر ڈال لیا۔ پھر اس نے نعمان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ نعمان اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے لڑکی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا اور جھکتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنے لب رکھ دیے۔ ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے بھی لڑکی کی نظریں اٹھی ہوئی تھیں اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

نعمان انہی پہاڑوں میں پل کر جوان ہوا تھا۔ یہاں سادات کی دست بوسی کو فرض سمجھا جاتا تھا مگر

یہ بوسہ اسے بہت مختلف محسوس ہوا۔ اس میں صرف عقیدت نہیں تھی اور پھر لڑکی کی نظریں......! وہ نروس ہو گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر لڑکی کی آنکھوں میں ردِ عمل کے طور پر دکھ اور شرمندگی دیکھ کر اسے افسوس ہوا۔ لڑکی بغیر کچھ کہے پلٹ کر چلی گئی۔

وہ کمرے میں پہنچے تو کھانا لگ چکا تھا۔ لڑکی بھی کمرے میں موجود تھی۔ باپ بیٹا کھانے کے لیے بیٹھے۔ نعمان جانتا تھا کہ وہ لوگ اُن کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے پھر بھی اپنی عادت کے مطابق وہ اُن سے اصرار کرتا رہا۔ کھانا بھی اس کے لیے حیران کن تھا۔ سالن بہت اچھا پکا ہوا تھا۔ بالکل شہر کے انداز میں۔

اس نے کھاتے کھاتے سر اٹھایا۔ لڑکی اب بھی اسے ہی تک رہی تھی۔ ''یہ بچی کون ہے چاچا رب نواز؟''

رب نواز کے جواب دینے سے پہلے لڑکی بول اٹھی۔ ''میں بچی نہیں ہوں۔'' اس نے دھیمی آواز میں بے حد اعتماد سے کہا۔

''ارے شاہ جی بابا...... نہیں پہچانے؟'' رب نواز نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنی جمیلہ ہے۔''

''واہ...... ماشاءاللہ بڑی ہو گئی۔ پچھلی بار جب میں نے دیکھا تھا تو بچی سی تھی۔'' نعمان بولا۔

''آپ چار سال سے آئے ہی نہیں۔'' جمیلہ نے سادگی سے کہا۔ نعمان نے چار سال پہلے کی یاد کے حوالے سے اسے بچی کہا تھا تو یہ اسے اپنی محبت کی توہین محسوس ہوئی تھی۔ سو اس نے بے حد وثوق سے کہا۔ ''میں چار سال پہلے بھی بچی نہیں تھی۔''

نعمان نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ سال کی ہو گی۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ مگر وہ اپنی عمر سے بڑی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی پختگی تھی اور لہجے میں اعتماد۔ انداز کسی حد تک جارحانہ تھا مگر بلاشبہ وہ بے حد حسین لڑکی تھی......

''ہاں شاہ جی بابا۔ چار سال پہلے بھی یہ گھر سنبھالتی تھی۔'' رب نواز نے وضاحت کی۔ ''اور اب تو سبھی کچھ یہی کرتی ہے۔''

نعمان نے سر جھکایا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ لڑکی کمرے سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ قہوہ لے کر آئی تو نعمان کھانا کھا چکا تھا۔ قہوہ عمران نے بھی بڑے شوق سے پیا مگر اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔

''چاچی کلثوم، اتنا اچھا کھانا کب سے پکانے لگیں تم؟'' نعمان نے کہا۔

''جمیلہ نے پکایا ہے۔''

''اوہ۔ اور ان چار برسوں میں گھر میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔''

''ان چار برسوں میں میری جمیلہ بڑی ہو گئی ہے نا۔'' کلثوم نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ سب اسی کا شوق ہے۔ ورنہ ہم تو سادہ زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔''

"بہت خوب۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔" نعمان نے کہا۔ پھر پُر خیال لہجے میں بولا۔ "تمہیں اپنی بیٹی کو پڑھانا چاہیے تھا۔"

"پانچ جماعتیں پڑھ گئی ہے تو گھر کا یہ حلیہ کر دیا ہے اس نے۔ دس جماعتیں پڑھ جائے تو شاید ہمیں گھسیٹ کر شہر لے جائے گی۔" بڈھا رب نواز جانے کیوں کھسیا گیا۔

جمیلہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "بابا...... میں اپنی اصل تو نہیں بھولی ہوں۔ جو کام بھی ماں کرتی تھی، وہ سارے کام میں بھی کرتی ہوں اور خوشی سے کرتی ہوں۔ چارا کاٹنا، بکریاں چرانا، بھینسوں کو باہر لے جانا، کون سے کام سے گھبراتی ہوں۔ بس اتنا تو کہتی ہوں کہ ٹھیک طرح سے رہنا چاہیے مگر اس میں بھی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے کو تو نہیں کہتی۔ تم بُرا سمجھتے ہو تو اب کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ نعمان شاہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے جوانی کی دہلیز پر کھڑی وہ معصوم لڑکی اسے بہت اچھی لگی۔

بڈھا رب نواز بوکھلا گیا۔ "ارے تو خفا کیوں ہوتی ہے۔ میں برائی میں تو نہیں کہہ رہا ہوں۔"

نعمان لڑکی کی طرف متوجہ تھا "تو تم پانچ جماعتیں پڑھی ہو؟" جمیلہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو یہ گھر میں اتنا بڑا انقلاب کیسے لے آئیں تم؟" نعمان نے ستائشی لہجے میں پوچھا۔

جمیلہ ایک دم خوش نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "میں نے بھائی سے کھانا پکانے کی ترکیبوں کی، گھر کی آرائش کی، کپڑے سینے کی اور کڑھائی کی بہت کتابیں منگوائی ہیں۔ ان سے سیکھتی ہوں۔

نعمان رب نواز کی طرف مڑا۔ "چاچا...... تمہاری بیٹی خوش ذوق بھی ہے اور سلیقہ مند بھی۔ اس کا بیاہ تو تم شہر میں ہی کرنا۔"

"یہ تو نصیبوں کی بات ہوتی ہے شاہ جی۔ آپ اس کے لیے دعا کرتے رہا کریں۔"

اچانک نعمان کو خیال آیا کہ یہ گفتگو ہندکو میں ہو رہی ہے۔ عمران بور ہو رہا ہوگا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ عمران بستر پر آڑا ترچھا لیٹا بے سُدھ سو رہا تھا۔ وہ اسے ٹھیک طرح سے لٹانے کے لیے اٹھ رہا تھا کہ جمیلہ نے اسے روک دیا۔ "آپ آرام سے بیٹھے رہیں۔ میں اسے لٹا دیتی ہوں۔" اس نے بڑی آہستگی سے ننھے عمران کو لٹایا، اس کے موزے اتارے اور دبیز لحاف اڑھا کر اسے کناروں سے اڑس دیا تا کہ سردی اندر نہ جائے۔ پھر وہ نعمان کی طرف مڑی۔ "آپ کا بیٹا بہت پیارا ہے...... بالکل آپ کی طرح۔ یہ آپ کے ساتھ سونے کا عادی تو نہیں۔"

"عادی تو ہے مگر اب یہ عادت اسے چھوڑنا پڑے گی۔ یہ اب یہیں رہے گا۔"

"کیوں؟" جمیلہ نے پوچھا۔

اس پر کلثوم نے بیٹی کو گھور کر دیکھا مگر نعمان نے کہا۔ "اس لیے کہ اس کا باپ بھی یہیں پلا بڑھا تھا۔ اس کی جڑیں بھی تو یہیں ہیں۔"

"اس کی امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟" جمیلہ نے آپ کی بیوی، کہنے سے احتراز کیا تھا۔

"میری بیوی کا انتقال ہوئے دو سال سے زیادہ ہو گیا۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جمیلہ کی آنکھوں میں تھرکنے والی چمک کسی کو نظر نہیں آئی تھی۔ بڈھا رب نواز ساتھ ہی کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ دنیا میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ بیوی کی موت کے بعد زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ فطری تقاضے کبھی نہیں مرتے۔ لہٰذا آدمی دوسری شادی کر لیتا ہے۔ دوسری بیوی بیوی تو بن جاتی ہے لیکن شوہر کے بچوں کی ماں نہیں بن پاتی۔ ہاں...... سوتیلی ماں بن جاتی ہے۔ رب نواز سوچ رہا تھا، یہاں بھی یہی پرانی کہانی دہرائی گئی ہوگی۔ اسی لیے شاہ جی بابا بچے کو یہاں لے آئے ہیں مگر سید بچے کی پرورش غیر سید گھرانے میں......

"شاہ جی بابا...... پھر آپ نے دوسری شادی کر لی؟" کلثوم نے پوچھا۔ شاید وہ بھی اس دوران یہی کچھ سوچتی رہی تھی۔ جمیلہ نے سانس روک لیا تھا اور متوقع نظروں سے نعمان کو دیکھ رہی تھی۔ نعمان نے حیرت سے کلثوم کو دیکھا۔ "نہیں تو۔"

"لیکن شاہ جی، خدا آپ کو بڑی عمر دے۔ پوری زندگی اکیلے تو نہیں گزار سکتے۔"

"میں اپنے بیٹے کو سوتیلی ماں کے جھنجھٹ میں نہیں پھنسانا چاہتا۔"

"تمام عورتیں تو ایک جیسی نہیں ہوتیں۔" کلثوم بولی۔

"درست ہے۔ لیکن شادی سے پہلے یہ کیسے پرکھا جا سکتا ہے کہ جس سے شادی کر رہا ہوں، وہ میرے بیٹے کی ماں بھی بن سکتی ہے۔"

پرکھا جا سکتا ہے اور پرکھ لینا۔ جمیلہ نے دل میں کہا۔ پھر بولی۔ "میں اسے اپنے ساتھ سلاؤں گی۔ لے جاؤں؟"

نعمان نے اثبات میں سر ہلا دی۔ جمیلہ نے لحاف میں لپٹے ہوئے عمران کو احتیاط سے گود میں اٹھایا اور لے کر چلی گئی۔

"اور یہاں کا حال سنائیں چاچا۔" نعمان نے کہا۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے شاہ جی۔ فصلیں بھی ٹھیک ٹھاک ہوتی رہی ہیں مگر آپ اب تفصیل سے بتائیں بیٹے کے سلسلے میں۔"

نعمان جانتا تھا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ پھر بھی اسے کوشش تو کرنا تھی۔ "چاچا رب نواز، میرا تجربہ ہے کہ ماں سے محروم بچے کمزور رہ جاتے ہیں۔ میں جسمانی کمزوری کی نہیں، اندر کی کمزوری کی بات کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان سے ہمدردی کر کے ہمیشہ انہیں اس محرومی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو ابتدا ہی سے توجہ دی۔ بیوی کی موت کے بعد تو میں بس اسی کا ہو گیا۔ اب اس کی تعلیم شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس ماہ کی ۲۷ تاریخ کو یہ چار سال کا ہو جائے گا۔

میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ مجھ سے دور ہو گا تو یہ ایک زندہ شخص کو یاد کرنا سیکھ لے گا۔ بجائے اس کے کہ اُس کو یاد کرے، جو اس دنیا میں نہیں اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی......" کہتے کہتے اسے دروازے کی سمت آہٹ محسوس ہوئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

رب نواز کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا۔ پڑھے لکھوں کی باتیں وہی جانیں۔ "مگر شاہ جی، یہاں تو وہ بہت تکلیف اٹھائے گا۔

"اسی لیے تو یہاں لایا ہوں اسے۔"

"میرا مطلب ہے، آپ اسے وہاں بھی داخل کرا سکتے ہیں۔ وہ جو اسکول میں بچوں کے رہنے کے لیے ہوتا ہے نا......"

"ہوسٹل۔" نعمان نے کہا۔ "ایسا کر دوں تو پھر یہاں آنے کا فائدہ۔ میں اسے اندر سے بھی اور جسمانی طور پر بھی مضبوط بنانا چاہتا ہوں۔ یوں تو کراچی میں اچھے اسکول کم نہیں مگر میرا مقصد کچھ اور ہے۔"

رب نواز کی سمجھ میں اس بار بھی کچھ نہیں آیا۔ "ہمیں کیا کرنا ہو گا شاہ جی بابا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بچے پالنا تو تمہیں آتا ہے چاچا۔ اسے اپنا بچہ سمجھنا......"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

"میرا مطلب ہے، اس کی تربیت میں کوئی نرمی نہ برتنا۔ اس کی حفاظت کی فکر نہ کرنا، اس کا بندوبست میں نے کر دیا ہے مگر اسے پتا نہ چلے۔ اس سے کھیتوں میں بھی کام لینا اور گھر میں بھی۔ جیسے اپنے بیٹوں سے لیتے تھے۔"

"شاہ جی بابا، بڑا مشکل کام ہے۔" رب نواز گڑگڑایا۔ "ہمیں گناہ گار کرائیں گے اس بڑھاپے میں۔"

"اور میرا حکم ٹالنا تمہارے خیال میں ثواب کا کام ہو گا؟" نعمان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

رب نواز کے کندھے جھک گئے۔ "جو حکم سرکار کا۔ آپ جانتے ہیں، ہم اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کریں گے۔"

نعمان نے سکون کی سانس لی۔ "اسکول میں داخلہ کرا کے آیا ہوں۔ یونیفارم، کتابیں، تمام ضروری چیزیں دلا دی ہیں۔ پرسوں سے یہ اسکول جائے گا۔ تین دن بعد اسکول کی چھٹیاں ہو جائیں گے۔"

"آپ بھی تو رکیں گے نا؟"

"چار پانچ دن تو ہوں یہاں۔ ایک مولوی صاحب سے بات کر لی ہے۔ جمعے کو وہ آئیں گے۔ عمران کی بسم اللہ بھی کرا دوں گا۔ پھر وہ روزانہ اسے قرآن شریف پڑھانے آیا کریں گے۔ بس اس کے بعد میں چلا جاؤں گا۔"

"اس بار اتنے برسوں کے بعد آئے ہیں۔ کچھ دن تو عزت بخشیں ہمیں۔" رب نواز گڑگڑایا۔

"کہا نا، چار پانچ دن تو رکوں گا مگر چاچا، اُدھر شہر کے کاروبار کا بھی تو خیال رکھنا ہے نا۔"

"زمین پر بھی چلیں۔ حساب کتاب بھی کرنا ہے۔"

"کل چلیں گے وہاں بھی۔ ویسے ریاض اور نیاز تو ٹھیک ہیں نا۔"

"ٹھیک ہیں۔ شاہ جی بابا، آپ اب آرام کریں۔ تھکے ہوئے ہوں گے۔ کوئی ضرورت ہو تو آواز دے لیجیے گا۔"

☆☆☆☆☆

رب نواز اور کلثوم کے اٹھنے سے پہلے ہی جمیلہ دروازے سے ہٹ آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور لحاف میں سمٹ گئی۔ عمران بے خبر سو رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی۔ اُس نے نعمان شاہ کی پوری گفتگو سنی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آئی بھی تھی مگر اسے حیرت تھی کہ نعمان شاہ جیسا پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی سامنے کی ایک بات کو کیسے نظر انداز کر گیا ہے۔ اُس نے بچے کو یہاں لانے کا مقصد تو بیان کر دیا تھا کہ یہ بھول گیا تھا کہ اسکول دنیا میں کہیں بھی ہوں، ایک سے ہوتے ہیں اور ان میں پڑھنے والے بچے بھی بس بچے ہی ہوتے ہیں اور بچوں کو سب سے عزیز اپنی ماں ہوتی ہے۔ اسکول میں ہر بچہ اپنے ساتھیوں سے اپنی ماں کا تذکرہ ضرور کرتا ہے۔ پھر آپس میں بحثیں ہوتی ہیں۔ میری ماں زیادہ اچھی ہے۔ نہیں...... میری ماں زیادہ اچھی ہے۔

نعمان شاہ اپنے بیٹے کو اس ماحول سے دور لے آیا تھا، جہاں قدم قدم پر اسے ماں کی محرومی کا احساس دلایا جاتا۔ یہاں اس نے ہدایت کر دی تھی کہ عمران کے سامنے اس کی ماں کا تذکرہ چھیڑا ہی نہ جائے۔ مقامی لوگوں کو سرے سے نہ بتایا جائے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ لیکن جب اسکول میں بچے اپنی ماؤں کا تذکرہ کریں گے تو ننھا بچہ کیا محسوس کرے گا اور جب وہ اس سے پوچھیں گے...... تمہاری ماں کیسی ہے عمران...... تو وہ کیا جواب دے گا۔ کیا اس طرح محرومی کا احساس اور نہ بڑھ جائے گا۔ جمیلہ نے نظریں اٹھا کر دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔ نو بجنے والے تھے۔ اسے حیرت ہوئی۔ یہ کیا ہو گیا۔ سردی کے موسم میں تو ساڑھے سات بجے تک سب بستر میں گھس جاتے تھے اور وہ خود تو آٹھ بجنے سے پہلے ہی سو جاتی تھی مگر اب تو آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ اس بار اُس نے عہد کیا تھا کہ وہ آئے گا تو اس سے دل کی بات ضرور کہے گی۔ مگر اس بار وہ اپنے ساتھ اپنے مسائل لے کر آیا تھا۔ تو اب کیا کرنا چاہیے۔ دل کی بات کہہ دی جائے یا پہلے اس کے مسائل پر توجہ کی جائے۔ یہ تو سچ ہے کہ وہ اس کے مسائل بڑی حد تک حل کر سکتی ہے اور یہ بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔ محبت کے ناطے یہ اُس کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ پہلے کی طرح، پہلے جیسا آیا ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلی جاتی اور اسے جگا کر بتاتی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اُس

کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بے شک وہ ناراض ہوتا...... کہتا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے لیکن آدمی شادی دوسری بھی کر سکتا ہے۔ وہ اس سے کہتی کہ مجھے تم سے بہت کچھ نہیں چاہیے۔ بس اپنا نام دے دو اور ہر سال ایسے ہی چند روز کی قربت۔ میں تمہاری بیوی سے حسد نہیں کروں گی۔ مجھے شہر جانے کی بھی کوئی آرزو نہیں بلکہ مجھے تو شہر برا لگتا ہے۔ بھائی ایک دن شہر لے کر گیا تھا مجھے۔ وہاں تو راستہ چلنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ میں تو شہر میں رہنا بھی نہ چاہوں۔ بس تم مجھے اپنا نام دے دو اور باضابطہ اپنا انتظار کرنے کا حق۔ وہ کہتا...... تم ابھی بچی ہو۔ میری تمہاری عمر میں بہت فرق ہے۔ پھر...... یہاں وہ جھنجھلا گئی۔ یہ عمر کی اتنی اہمیت کیوں ہے اور ہے تو خدا نے مجھے اس سے برسوں پہلے پیدا کیوں نہیں کر دیا۔ وہ تو جانتا ہوگا کہ مجھے اس سے پیار ہو جائے گا۔ اس نے مجھے بنایا ہی اس کے لیے ہے۔ تو پھر کیوں...... کیوں...... کیوں آخر؟ وہ جھنجھلاتی رہی۔ پھر وہ کوشش کر کے اس جھنجھلاہٹ سے نکلی۔ کچھ بھی ہو، میں اسے قائل کر ہی لیتی۔

وہ سوچتی رہی۔ قائل تو میں اب بھی کر سکتی ہوں۔ کیسے؟ ذہن نے سوال کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تصور کی دنیا میں چلی گئی۔

وہ اُس کے کمرے میں تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ وہ بستر کی طرف بڑھی۔ اس نے لحاف کو چاروں طرف سے اڑس کر ایک قلعہ سا بنا لیا تھا سردی کے خلاف۔ اس نے اس کے پیروں کی طرف سے لحاف کو کھولا اور اس کا پاؤں پکڑ کر ہلایا۔ ٹھنڈے ہاتھ سے اسے کرنٹ سا لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کون...... کون ہے؟''

''میں ہوں نعمان صاحب۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کون؟ جمیلہ؟''

''جی ہاں۔''

''کیا بات ہے۔''

''آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''اتنی رات کو؟ صبح کر لینا۔''

''نہیں جی...... ابھی کرنے کی بات ہے۔'' اُس کے جسم کے ساتھ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی اور وہ صرف چادر لپیٹ کر چلی آئی تھی۔

''ارے...... تم تو سردی سے کانپ رہی ہو۔ کچھ پہنا بھی نہیں ہے تم نے۔''

''جلدی میں خیال ہی نہیں رہا جی۔''

''تو اپنے کمرے میں بھاگ جاؤ۔ بات صبح کر لینا۔'' اس نے اسے یوں ڈپٹا، جیسے وہ بہت چھوٹی سی بچی ہو۔

''نہیں جی، بات کیے بغیر میں نہیں جاؤں گی۔''

وہ چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر لحاف سے نکلتے ہوئے بولا۔ ''آؤ...... اتنی ہی ضروری بات ہے تو لحاف میں بیٹھ جاؤ۔''

''لحاف سے نہ نکلیں۔ ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو۔''

''اب تمہیں لگ رہی ہے۔''

''ٹھنڈ سے تو ہم دونوں ہی بچ سکتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ کسی ایک کو ٹھنڈ لگے ہی لگے۔''

وہ پھر ہچکچایا۔ پھر لحاف میں دوبارہ بیٹھتے ہوئے اس نے لحاف کا ایک کونا اٹھا دیا۔ ''آؤ...... آ جاؤ۔'' اس نے لٹھ مار لہجے میں کہا ''اور جلدی سے بات بتاؤ اور اپنے کمرے میں جاؤ۔''

وہ لحاف میں بیٹھ گئی۔ وہ حتی الامکان اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر لحاف میں زیادہ وسعت نہیں ہوتی اسی لیے وہ گرم ہوتا ہے۔ ''مجھے عمران کے متعلق بات کرنی ہے۔'' وہ بولی۔

''عمران کے متعلق؟'' اس نے چونک کر کہا۔

''جی ہاں۔ اسے ماں کی ضرورت ہے۔'' وہ بولی۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ اسکول میں بچے ہمیشہ ماں کی باتیں ضرور کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔ عمران سے کوئی پوچھے گا تو وہ کیا کرے گا۔ آپ کا اسے یہاں لانے کا مقصد تو فوت ہو جائے گا۔ محرومی کا شدید احساس اسے کمزور کر دے گا۔ (تصور میں بھی اسے احساس ہوا کہ وہ چھوٹے شاہ جی کی زبان بول رہی ہے)

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ چونکا تھا، ہل کر رہ گیا تھا۔ ''مگر میں ماں کہاں سے لاؤں اس کے لیے۔''

''میں اس کی ماں بنوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ......

عمران نے کروٹ بدلی تو تصور ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ اس نے عمران کو دیکھا۔ ہو بہو باپ کی تصویر۔ اسے اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ اس نے اُس کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیے۔ پھر وہ بستر سے نکل آئی۔ اس نے عمران کو اچھی طرح لحاف اڑھایا اور کلاک کی طرف دیکھا۔ سوا بارہ بجے تھے۔ اس نے چادر اوڑھی پھر اسے اپنے تصور کا خیال آیا۔ وہ مسکرائی۔ اس نے سرہانے رکھی ہوئی جیکٹ اٹھا کر پہنی، چادر اوڑھی اور کمرے سے نکل آئی۔

نعمان کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ دروازہ اندر سے بند بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے دروازے کو دھکیلا۔ دونوں پٹ کھل گئے۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ پھر بھیڑ دیا پھر وہ اس کے بستر کی طرف بڑھی۔ اس کی پائنتی کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اسے اچانک نعمان کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ حیرت کی بات تھی کہ اسے پہلے خیال کیوں نہیں آیا۔

تصور کے پردے پر پھر فلم چلنے لگی۔ وہیں سے جہاں سے ٹوٹی تھی۔ نعمان نے نظریں اُٹھا کر اسے

دیکھا۔ "یہ ممکن نہیں۔ اول تو تم خود ابھی بچی ہو۔ میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ پھر میں اپنے بیٹے کو سوتیلی ماں کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

جمیلہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ "لیکن سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں اسے سگی ماں سے بڑھ کر پیار دوں گی۔"

"ابھی پوری سچائی سے کہہ سکتی ہو لیکن بعد میں بدل بھی سکتی ہو۔ نہ بدلنے کی کوئی ضمانت ہے تمہارے پاس؟"

"میرا دل ضمانت ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں...... قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں۔"

"سنو لڑکی...... میں اس سلسلے میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

فلم ٹوٹ گئی۔ جمیلہ کا بڑھا ہوا ہاتھ ٹھٹک گیا تھا۔ اس نے سوچا، واقعی اب تو بات کرنا فضول ہے۔ بات پوری طرح بگڑ جائے گی۔ پھر شاید وہ اپنے بیٹے کو بھی یہاں نہ رکھے۔ تب تو ناتا ہی ٹوٹ جائے گا۔ بے صبرا پن ٹھیک نہیں۔ تحمل سے کام لینا ہوگا لیکن یہ بات بنے گی کیسے؟ کس امید پر صبر کیا جائے؟

اچانک اس کا ذہن روشن ہو گیا۔ اُس نے سوچا، یہ یقین تو وہ اسے کسی بھی طرح نہیں دلا سکتی کہ وہ سوتیلی ماں نہیں، بلکہ سگی ماں سے بڑھ کر ثابت ہو گی۔ حالانکہ یہ کبھی نہ بدلنے والا سچ تھا۔ مگر جو آدمی اعتبار نہ کرنا چاہے، اسے کسی بھی طرح یقین نہیں دلایا جا سکتا۔ ہاں...... وہ یہ بات ثابت کر سکتی ہے۔ یہ اُس کے اختیار میں ہے۔ وہ عمران کے لیے سگی ماں سے بڑھ کر ثابت ہو سکتی ہے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ عمران سے اسے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی اور وہ اسے نعمان کی محبت دلا سکتا تھا......

"کیا بات ہے؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ یہ درشت آواز سن کر اُچھل ہی پڑی۔ اُس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

نعمان شاہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ اسے کروٹیں بدلتے گھنٹوں ہو گئے تھے اور اب وہ پریشان تھا۔ نیند نہ آنے کی وجہ اسے معلوم تھی۔ بستر اسے خالی خالی لگ رہا تھا۔ عادت کے مطابق اس کا ہاتھ بار بار پہلو کی طرف جاتا...... عمران کو تھپکنے کے لیے لیکن وہاں بستر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسکی گردن میں بیٹے کی بانہیں بھی نہیں تھیں۔ وہ ننھا سا وجود اُس کے جسم سے لپٹا ہوا نہیں تھا۔

کئی بار وہ اپنے فیصلے پر پچھتایا اور کئی بار اس نے ارادہ کر لیا کہ صبح ہی عمران کو لیکر واپس چلا جائے گا لیکن وہ جانتا تھا کہ محبت کرنا بہت آسان ہے۔ البتہ محبوب کی بہتری کا خیال رکھنا بہت دشوار کام ہے۔ جانے کس کس موقع پر کیسے کیسے زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ بچے تو ابتدا میں اسکول جاتے ہوئے روتے ہیں کہ انہیں والدین سے جدا ہونا گراں گزرتا ہے۔ بچے کو اپنی نظروں سے دور کرنا والدین کے لیے بھی کٹھن ہوتا ہے لیکن بچے کو آہستہ آہستہ گھر کے کنوئیں سے نکالنا اور دنیا سے متعارف کرانا ضروری

ہوتا ہے۔ بچوں کو مشکلات سے گزارنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کون جانے، بڑے ہو کر انہیں کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑے۔ وہ محبت بہت خطرناک ہوتی ہے، جو چمٹ کر رہ جائے، قبضہ کر کے رکھنا چاہے۔ محبوب کو مضبوطی دینے کی بجائے قدم قدم پر اس کا ہاتھ تھام کر اسے سہارے کا عادی بنائے۔ وہ جانتا تھا کہ محبت میں بڑے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں...... ایسے دکھ جن سے بچنا بہت آسان لیکن محبوب کے لیے بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ایسی ہی اذیت سے گزر رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ محض اذیت کا نکتہ آغاز ہے۔ اس کو یہاں چھوڑ کر چلا جائے گا تو کیا ہوگا۔ یہ بیٹا اسے بہت محبوب تھا۔ صبح ہوتے ہی اسے لے کر واپس کراچی چلے جانا بہت آسان تھا لیکن اس کے نکتہ نظر سے عمران کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں تھا۔ اسے دل پر یہ بھاری پتھر رکھنا ہی تھا۔

اُس نے ایک آہ بھر کر کروٹ بدل لی۔ وہ زیادہ پریشان اس لیے تھا کہ وہ عمران کی کمی کو اتنا محسوس کر رہا ہے تو عمران کا کیا حال ہوگا۔ اس بے چارے کے پاس تو پاپا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

اُسی لمحے دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ روشنی کم تھی۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ اسے نہ پہچان پاتا۔ وہ جمیلہ تھی...... رب نواز کی حیران کر دینے والی بیٹی۔ اس وقت بھی اس نے اسے حیران کر دیا تھا۔

جمیلہ نے دروازہ بھیڑ دیا۔ نعمان خاموش رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ لینے آئی ہے۔ کیوں خواہ مخواہ خود کو جاگتا ظاہر کرے۔ وہ مطلوبہ چیز لے کر چلی جائے گی اور بس۔

لیکن جمیلہ اس کی طرف بڑھی آ رہی تھی۔ وہ اب بھی نہ بولا۔ ممکن ہے، جس چیز کی اسے تلاش ہو، وہ اسی طرف رکھی ہو۔

جمیلہ اس کے بستر کی پائنتی کی طرف بہت قریب چلی آئی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ لگتا تھا کہ اس کا پاؤں ہلانے والی ہے۔ مگر پھر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کا ہاتھ پھیلے کا پھیلا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے، جیسے وہ کسی کشمکش سے دوچار ہو۔ جانے کتنی دیر وہ یونہی کھڑی رہی۔ اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ نعمان اس کے خوبصورت اور معصوم چہرے کو تکتا رہا۔ وہ عجیب محویت تھی، جیسے کوئی سحر......

پھر وہ سحر ٹوٹ گیا۔ نعمان کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔ جمیلہ اس گھرانے کی بچی تھی، جس کے لوگ ڈیڑھ صدی سے اُس کی اور اُس کے آباؤ اجداد کی خدمت کرتے آئے تھے۔ وہ ان کا ایسا احترام کرتے تھے کہ اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ سادات کی عزت اور عقیدت کو انہوں نے اپنی بخشش اور نجات کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ نعمان کو حیرت ہوتی تھی۔ یہ جذبہ ان لوگوں کے عشق رسول کا مظہر تھا۔ اس کے نزدیک وہ لوگ اُس سے بڑے تھے۔ اُن کی لگن، ان کی محبت بڑی سچی تھی۔

ایسی عقیدت، ایسی محبت، ایسا احترام بڑی ذمے داری کا متقاضی ہوتا ہے۔ نعمان کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا تھا۔ اس علاقے میں سادات کی عزت، شفاف شیشے کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں بال بھی

نہیں آنا چاہیے حالانکہ سادات میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اس عزت و احترام کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ وہ اپنے افعال و اعمال کے معاملے میں بے پرواہ تھے لیکن نعمان ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا کہ کم از کم خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لیے پیہم کوشش کرتا رہے۔ اس کے باوجود یہ احترام اسے شرمندہ کرتا رہتا تھا۔

اور اب یہ لڑکی بت بنی اس کے پیروں کے بہت قریب کھڑی تھی...... یہ طے تھا کہ وہ کچھ لینے نہیں آئی ہے۔ ورنہ وہ یوں کھڑی نہ رہتی اور یہ خطرناک بات تھی۔ کلثوم یا رب نواز اسے کمرے میں یا کمرے سے نکلتے دیکھ لیتے تو کیا سوچتے اس کے بارے میں۔

اُس نے کسمسانے کی اداکاری کی اور آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ ''کیا بات ہے؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اُس نے درشت لہجے میں پکارا۔

لڑکی اچھل پڑی۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے ہوا۔ ''میں...... میں...... آتش دان میں لکڑیاں ڈالنے آئی تھی۔''

''تمہیں اس طرح میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہارے ماں باپ ہمارا اتنا احترام کرتے ہیں اور تم ہمارے آرام میں خلل ڈالنے چلی آئیں۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔'' اس نے بات مختلف انداز میں کہی۔ لڑکی نے سکون کی سانس لی۔ ایک تو نعمان نے بات اس انداز میں نہیں کہی، جس سے وہ ڈر رہی تھی۔ وہ بات سننے کے بعد اُس کے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا اور وہ ہر مصلحت بھول کر دل کی بات کہہ بیٹھتی۔ دوسرے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ سو رہا تھا، ابھی جاگا ہے۔ پہلے سے جاگ رہا ہوتا تو اسے بہت بری لڑکی سمجھتا۔ کتنا برا ہوتا۔

''عمران سو رہا ہے؟ بے چین تو نہیں ہوا؟ مجھے پکارا تو نہیں اُس نے؟'' نعمان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جی، تکیے سے لپٹ کر سو رہا ہے۔''

''مجھ سے لپٹ کر سونے کا عادی ہے۔''

''اب مجھ سے لپٹ کر سویا کرے گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ بچے آسانی سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ بڑوں کو پریشانی ہوتی ہے۔''

نعمان پھر حیران رہ گیا۔ اتنی سیدھی سادی سی کم عمر لڑکی اور اتنی دانش کی بات۔ بچے واقعی آسانی سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔

''اچھا...... اب تم جاؤ۔'' نعمان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں...... عمران کو صبح اپنے ساتھ ہی جگا دینا۔''

''اچھا جی...... لیکن سردی بہت ہوگی۔ چھوٹا سا بچہ ہے وہ......''

''جو میں کہتا ہوں، وہی کرو۔ اسے سردی کا عادی ہو جانا چاہیے۔ اب تم جاؤ۔''

جمیلہ پلٹی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور دروازے کو دوبارہ بھیڑ دیا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اندھیرے میں کھڑا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد کلثوم نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ شام ہی سے جمیلہ کا انداز اسے غیر معمولی لگا تھا اور اس کی نظروں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اداس تھی کہ اس کی الہڑ اور معصوم بیٹی چاند کی آرزو کر رہی ہے۔ وہ فکر مند ہوئی لیکن اس طرح نہیں، جس طرح اس صورت حال میں جوان بیٹیوں کی مائیں پریشان ہوتی ہیں۔ اسے اپنی بیٹی کی معصومیت پر بھی یقین تھا اور شاہ جی بابا کی شرافت پر بھی اعتماد تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ چاند زمین پر رہنے والوں کی بانہوں میں کبھی نہیں آتا۔ انہیں صرف چاندنی ہی مل سکتی ہے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر جمیلہ نے جیکٹ اتاری اور بستر میں گھس گئی۔ اُس نے سوتے ہوئے عمران کو پیار کیا اور اسے لپٹا لیا۔ ''تم اپنے پاپا سے لپٹ کر سوتے تھے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''ننھے...... اب تم مجھ سے لپٹ کر سویا کرو گے...... اپنی امی سے۔''

☆☆☆☆☆

ننھا عمران کسمسایا اور آنکھیں کھولنے سے پہلے عادت کے مطابق پاپا سے لپٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا ورنہ ابھی وہ پاپا سے لپٹ کر کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا۔ آنکھیں کھلتے ہی گڑبڑ بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ پاپا کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی، جس نے رات تولیے سے اس کے ہاتھ پونچھے تھے۔ پھر وہ کھانا بھی لائی تھی۔ وہ اسے پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھی لیکن تھکن کی وجہ سے وہ اسے توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اسے نیند بھی تو بہت آ رہی تھی۔ ورنہ وہ اس سے باتیں کرتا۔ وہ اپنا ہاتھ ہٹائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ خود ہی اسے لپٹائے ہوئے سو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے گرد تھا۔ وہ بہت پیاری تھی مگر سوتے میں اور زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے جسم کا نرم گرم لمس ننھے عمران کو جانا پہچانا لگا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی، جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتے آتے سمجھ کی پہنچ سے دور ہو جائے۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر تھک کر اس نے کوشش ترک کر دی۔ بس اتنی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ لمس اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ بڑی آہستگی سے اٹھا اور بلا ارادہ اُس نے جھک کر لڑکی کے رخسار چوم لیے۔ بعد میں وہ خود بھی اس پر حیران ہوا۔ اس نے پاپا کے سوا کبھی کسی کو پیار نہیں کیا تھا۔

وہ پیشانی چوم رہا تھا کہ لڑکی نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت چمکی پھر وہ مسکرائی۔ اُس لمحے وہ اور خوبصورت لگی۔ ''اٹھ گئے ننھے اور مجھے پیار بھی کر رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے، میں تمہیں اچھی لگی ہوں۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور سلام کیا۔ جمیلہ شرمندہ ہو گئی۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور بولی۔ ''صبح سب سے پہلے سلام کرتے ہو۔ بڑی پیاری عادت ہے۔''

''پاپا کہتے ہیں۔ صبح اٹھتے ہی کلمہ پڑھا کرو اور پھر بڑوں کو سلام کیا کرو۔'' عمران نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پاپا کا خیال آیا اور یہ یاد آیا کہ وہ اس وقت بالکل اجنبی جگہ ہے۔ ''میرے پاپا کہاں ہیں؟'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ وہ تو لڑکی کی خوبصورتی نے اسے مسحور کر دیا تھا ورنہ امکان یہی تھا کہ وہ آنکھ کھلتے ہی پاپا کو پکارتے پکارتے رونے لگتا۔

''تمہارے پاپا دوسرے کمرے میں ہیں اور شاید ابھی سو رہے ہیں۔ تم مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ اس لیے میں تمہیں اپنے کمرے میں لے آئی۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟''

عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جی نہیں، بہت اچھا لگا۔''

جمیلہ مسکرانے لگی ''روز میرے ساتھ سویا کرو گے؟''

عمران کو یاد آ گیا کہ پاپا اسے یہاں کیوں لائے ہیں۔ ''پاپا تو چلے جائیں گے۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں آپ کے پاس سویا کروں گا۔''

''اس لیے سوؤ گے کہ پاپا نہیں ہوں گے۔ ویسے نہیں۔''

عمران کو احساس ہوا کہ اُس نے اس پیاری لڑکی کا دل دکھا دیا ہے۔ ''یہ بات نہیں، آپ بہت اچھی ہیں۔ پاپا اگر یہاں رہیں، تب بھی میں آپ کے پاس سوؤں گا۔ مگر کبھی کبھی پاپا کے پاس بھی چلا جایا کروں گا۔''

جمیلہ کو اس پر پیار آ گیا۔ معصوم بچہ اس کا دل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اسے آغوش میں بھر لیا۔ تم تو مجھے اپنے پاپا سے بھی زیادہ چاہو گے۔ دل میں وہ خود سے بولی...... دیکھنا میری محبت کا جادو۔ وہ اٹھی اور اس کے گرم کپڑے نکال لائی۔ اس نے اس کے کپڑے بدلوائے پھر بولی۔ ''چلو......اب چل کر منہ دھو لو۔''

غسل خانے میں گرم پانی موجود تھا۔ جمیلہ مسواک سے دانت صاف کرنے لگی۔ عمران اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ مسواک ہے۔ اس سے دانت صاف کرتے ہیں۔'' جمیلہ نے بتایا۔

''اچھا۔ یہ یہاں کا ٹوتھ برش ہے۔'' عمران نے معصومیت سے کہا۔

جمیلہ ہنسنے لگی۔ ''تم بھی دانت صاف کرو گے اس سے؟'' اس نے پوچھا۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے ثمر کی ایک چھوٹی اور پتلی مسواک اسے بھی دے دی۔ پھر اس نے اسے طریقہ سمجھایا۔ ''یہ نہ ہو کہ مسوڑھے چھیل لو۔ شاہ سرکار تو ہمیں کچا چبا جائیں گے۔''

مسواک کر کے عمران نے آئینے میں اپنے دانت دیکھے۔ وہ اسے بہت چمکیلے لگے۔ ''اب آپ کیا کریں گی؟'' اس نے جمیلہ سے پوچھا۔

''کام ہی کام ہے میرے لیے۔ مرغیوں کو کھولوں گی۔ بھینسوں اور بکریوں کو چارا دوں گی۔ پھر مکھن نکالوں گی۔''

عمران خوش ہو گیا۔ ''بھینسیں بھی ہیں آپ کے پاس اور بکریاں بھی۔'' مرغیوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''ہاں۔ پوری چھ بھینسیں ہیں ہمارے پاس۔ بکریاں پندرہ ہیں۔''

''میں بھی کام کروں گا آپ کے ساتھ؟''

''دل چاہے تو کرو۔ مگر پہلے دیکھ لو۔''

''میں پہلے پاپا کو دیکھوں گا۔''

جمیلہ اسے کمرے تک لے گئی۔ ''اس کمرے میں تمہارے پاپا سو رہے ہیں۔ جاؤ دیکھ آؤ۔''

عمران اندر چلا گیا۔ پاپا سو رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ انہیں پیار کرے لیکن وہ قریب کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پاپا تو اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے پھر وہ کیا کرے گا۔ کسے پیار کرے گا...... وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔

''چلیں...... بھینسوں کو چارا دیں۔'' اس نے جمیلہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں غیر معمولی چہکار تھی۔

☆☆☆☆☆

نعمان شاہ کی آنکھ صبح آٹھ بجے کھلی تو سورج مشرق سے سر اٹھا چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بستر میں لیٹا رہا۔ مسلسل سفر کی تھکن کے بعد آرام سے سونے کا موقع جو ملا تو بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔

رات کی بات اسے خواب کی طرح یاد تھی لیکن اس خواب نے ہی اسے سلایا تھا۔ جمیلہ نہ آتی اور اس سے بات نہ ہوتی تو وہ یقیناً اب تک جاگ رہا ہوتا۔ ایک پل بھی نہ سو پاتا۔ بات اب اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ وہ پریشان اپنے لیے نہیں تھا۔ وہ تو ایک بڑا فیصلہ کر کے گھر سے چلا تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ اس کے، ماں سے محروم بیٹے کے لیے یہ امتحان بہت زیادہ سخت ہو گا۔ جمیلہ نے جب اسے بتایا کہ وہ سکون سے سو رہا ہے اور اس نے ایک بار بھی اسے نہیں پکارا تو اس کا پہلا ردِعمل اطمینان کا تھا۔ پھر اسے افسوس ہوا کہ وہ کروٹیں بدل رہا ہے اور بیٹا سکون سے سو رہا ہے۔ اسے خوف آیا کہ عمران اسے بھول جائے گا...... اُس سے دور ہو جائے گا مگر اس خیال کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ایسا ہو جائے، تب بھی کیا حرج ہے۔ اس نے سوچا۔ بس وہ کچھ بن جائے۔ والدین بچوں کی پرورش اس شرط پر تو نہیں کرتے کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں، ان سے محبت کریں۔ اسے اس حیرت انگیز لڑکی جمیلہ کا وہ دانش ورانہ جملہ یاد آیا...... بچے آسانی سے سمجھوتا کر لیتے ہیں...... تو وہ مسکرا دیا۔ وہ بڑا حوصلہ دینے والا جملہ تھا۔ اس جملے نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ اس کے اندیشوں کو ایک لمحے میں غیر اہم بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور واقعی یہ سچ تھا۔ بچوں کو جس ماحول میں ڈال دو، وہ اسے اپنا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ناپختہ ہوتے ہیں۔ کچی مٹی کی

طرح۔ جس طرف چاہو، موڑ دو، جو روپ چاہو، دے دو اور بچوں میں خواہش بقا بہت توانا ہوتی ہے۔

وہ اٹھا اور بستر سے نکل آیا۔ دروازے سے نکلتے ہی اس نے عادت کے مطابق تھوڑی سی ایکسرسائز کی۔ کمرے میں ایکسرسائز کرنا باہر کی سردی کی وجہ سے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ ایکسرسائز کا یہ فائدہ ہوا کہ سخت سردی کا احساس زائل ہو گیا۔

باورچی خانے سے کلثوم نکل آئی۔ نعمان نے اسے سلام کیا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگی۔ ''آج سردی زیادہ ہے شاہ جی بابا۔'' ذرا دیر بعد وہ بولی۔ ''رات کو بہت کہرا پڑا تھا۔''

نعمان نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس کا اپنا اندازہ بھی یہی تھا۔

''آپ غسل خانے میں چلیں، میں گرم پانی لاتی ہوں۔'' کلثوم یہ کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ نعمان نے اپنے کمرے میں آ کر بیگ سے توتھ پیسٹ، تولیا اور صابن نکالا۔ اسے عمران کا خیال آ گیا۔ عمران نے دانت کیسے صاف کیے ہوں گے۔ کیا پتا، سو رہا ہو ابھی۔

وہ باتھ روم کے دروازے پر تھا کہ کلثوم باہر نکلی۔ وہ گرم پانی لے آئی تھی۔ ''چاچی...... عمران کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

کلثوم مسکرائی۔ ''سرکار وہ تو جمیلہ کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ بہت سویرے اٹھ گئے تھے جی وہ۔''

نعمان باتھ روم میں چلا گیا۔ باہر آیا تو کلثوم نے بتایا کہ اس نے ناشتا کمرے میں رکھ دیا ہے۔ رب نواز بھی کمرے میں موجود تھا۔ پھر کلثوم بھی لسی کا جگ لیے کمرے میں چلی آئی۔ لسی دیکھ کر نعمان کو تھرتھری چڑھ گئی۔ اس موسم میں لسی۔ حالانکہ بیس برس پہلے تک وہ ہر موسم میں لسی پیتا رہا تھا۔

رب نواز نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔ ''شہر جانے کے بعد آپ پہلی بار سردی میں آئے ہیں نا'' وہ بولا ''لیکن شاہ جی بابا، لسی کبھی نقصان نہیں کرتی۔''

نعمان کو شرمندگی ہوئی۔ ''عمران کو بھی بلا لیں۔ اس نے ناشتا نہیں کیا ہوگا۔''

''نکے شاہ جی نے تو سویرے ہی ناشتا کر لیا تھا جی۔''

''لسی بھی پی تھی؟'' نعمان نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں شاہ جی بابا۔ بڑے شوق سے ناشتا کیا انہوں نے۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ دیہاتی ناشتا نہیں کریں گے۔ وہ توس مانگیں گے مگر جی انہوں نے تو ڈٹ کر موٹی روٹی مکھن کے ساتھ کھائی اور خوب لسی پی۔ میرا تو دل خوش ہو گیا شاہ جی بابا۔''

رب نواز نے نعمان کی تشویش محسوس کر لی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں شاہ جی بابا۔ آپ کا بیٹا ان پہاڑوں کا، اس زمین کا بیٹا ہے۔ وہ تو دو گھنٹے میں یہاں ایسا ہو گیا، جیسے یہیں پیدا ہوا ہو۔''

''آج سردی بہت ہے چاچا......''

''نا جی شاہ جی بابا، سردی اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ سردی سے لڑنا تو اس کے خون میں موجود ہے۔''

نعمان کا سینہ فخر سے بھر گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اس کا، کراچی کے موسم کا عادی بچہ اتنی سخت سردی میں بستر سے نکلنے کی ہمت بھی کر سکے گا لیکن وہ تو صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا اور باہر گھوم پھر رہا تھا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ بچے فطرت سے کس قدر قریب ہوتے ہیں۔ وہ ناشتا کر کے باہر نکل آیا۔ سورج کچھ اوپر ہو گیا تھا۔ دسمبر کی پھیکی نرم دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور گرد و پیش کو دیکھ کر مسکرایا۔ بیس سال! اسے یہاں سے گئے بیس سال ہو چکے تھے اور بیس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دسمبر میں یہاں آیا تھا۔ وہ بھول ہی چکا تھا کہ سردیوں میں یہ علاقہ کتنا حسین ہو جاتا ہے۔ شوقین لوگ گرمیوں میں یہاں آتے ہیں اور یہاں کے حسن کی تعریف کرتے نہیں تھکتے لیکن وہ سردیوں میں اس علاقے کو دیکھیں تو اس کی خوبصورتی دیکھ کر ان کی سانسیں رک رک جائیں۔ پتوں سے محروم درخت، بادلوں میں چھپی ہوئی پہاڑی چوٹیاں، فضا کا شفاف سا دھندلا پن۔ سب کچھ خواب لگتا ہے۔ حسین خواب۔ پھر اچانک بادل سرکتے ہیں تو کسی پہاڑی کی چوٹی یوں جھانکتی نظر آتی ہے، جیسے کسی دلہن نے گھونگھٹ اٹھا لیا ہو اور اگلے ہی لمحے بادل پھر اسے چھپا لیتے ہیں اور پھر وہی خواب خواب منظر۔ کمال یہ ہے کہ سب کچھ مسلسل دیکھنے کے باوجود یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ فطرت کا یہ تنوع کبھی کبھی تو ناقابل یقین محسوس ہوتا ہے۔

وہ کھیت سے نکلا تو ایک درخت کے نیچے اسے جمیلہ اور عمران بیٹھے نظر آئے۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے بیٹھے تھے، جیسے ان کے درمیان دوستی کا تعلق استوار ہو چکا ہو۔ اسے دیکھتے ہی عمران بھاگا بھاگا اس کی طرف آیا۔ ''السلام علیکم پاپا۔''

نعمان نے اسے گود میں اٹھا کر سر سے بلند کر لیا۔ ''وعلیکم السلام بیٹے۔'' اس نے دو تین جھکولے دے کر اسے نیچے اتار دیا۔ ''کیسی لگی یہ جگہ؟''

''بہت اچھی ہے پاپا۔'' عمران نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آئیں...... آپ بھی درخت کے نیچے بیٹھیں۔''

نعمان نہیں چاہتا تھا لیکن بہت عرصے کے لیے بچھڑنے والے بیٹے کی فرمائش رد نہ کر سکا۔ وہ درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ جمیلہ نے اسے سلام کیا مگر خلاف معمول دست بوسی کے لیے اس کا ہاتھ طلب نہیں کیا۔ ''عمران نے صبح اٹھنے میں تنگ تو نہیں کیا تمہیں؟'' نعمان نے اس سے پوچھا۔

جمیلہ مسکرائی ''نہیں جی۔ الٹا آپ کے بیٹے نے مجھے جگایا تھا۔''

''واہ، بہت اچھی بات ہے۔ ویسے یہ ابتدا ہی سے جلدی جاگنے اور جلدی سونے کا عادی ہے۔'' نعمان نے کہا۔ پھر وہ بیٹے کی طرف مڑا۔ ''عمران بیٹے، آج تم نے دانت صاف کیے بغیر ہی ناشتا کر لیا۔ تمہارا برش اور ٹوتھ پیسٹ میں نے ابھی نکال کر باتھ روم میں رکھا ہے۔''

"پاپا...... میں نے دانت مسواک سے صاف کیے تھے۔ یہ دیکھیں۔" عمران نے اسے دانت دکھائے۔

"واہ...... یہ تو بہت چمک رہے ہیں۔" نعمان نے کہا اور اٹھنے لگا۔ لیکن عمران نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بیٹھیں نا پاپا، ابھی نہ جائیں۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"بیٹے...... چاچی نے چائے بنالی ہوگی۔ میں جا کر چائے پیوں گا۔"

جمیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آپ بیٹھیں شاہ جی سرکار۔ چائے میں آپ کو یہیں لا دیتی ہوں۔"

عمران نے اس کا بھی ہاتھ تھام لیا۔ "چائے میں لے کر آؤں گا اپنے پاپا کے لیے، آپ دونوں یہیں بیٹھیں۔" اس نے کہا اور دوڑ لگا دی۔

"ایک بات پوچھوں شاہ جی سرکار۔ برا تو نہیں مانیں گے؟" اچانک جمیلہ نے پوچھا۔

"پوچھو۔" نعمان نے بادل ناخواستہ کہا۔ اسے اس لڑکی سے خوف آنے لگا تھا۔

"آپ کو تو اپنی زمینوں سے بہت پیار ہے۔ ہے نا؟"

"ہر شخص کو ہوتا ہے۔ مجھے بھی ہے۔" نعمان نے کہا۔

"تو پھر آپ نے کسی مقامی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"اس لیے کہ یہاں تعلیم یافتہ لڑکیاں کم ہی ملتی ہیں اور مجھے تعلیم یافتہ بیوی کی ضرورت تھی۔"

وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "اگر بی بی صاحبہ حیات ہوتیں تب بھی آپ اپنے بیٹے کو اس عمر میں یہاں لاتے؟"

"ہاں۔" نعمان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تب بھی یہاں آتا اور اسی طرح رہتا۔ یہ تو میں نے ابتدا میں ہی سوچ لیا تھا۔"

"لیکن آپ بی بی صاحبہ کو یہاں کبھی نہیں لائے۔"

نعمان خاموش رہا۔ اس بات کا جواب وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ابتدا میں ہی لڑکی کو روک دینا چاہیے تھا۔ مگر اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ عمران کو بہت اچھی طرح ہینڈل کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ اس سے تلخی نہیں چاہتا تھا۔ "بس...... موقع ہی نہیں ملا۔ صرف پانچ سال کا تو ساتھ تھا ہمارا۔"

"تو بیوی کے لیے تعلیم ضروری ہے۔" جمیلہ کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "شاہ جی سرکار، برا نہ مانیں تو اس کی وجہ بھی بتا دیں۔"

"ایسی بیوی بچوں کی تعلیم کا خیال رکھ سکتی ہے۔ ان کی اچھی تربیت ہو سکتی ہے۔" نعمان نے بے حد تحمل سے کہا۔

جمیلہ اس کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتی تھی لیکن وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ آپ تو تعلیم یافتہ بیوی کے ہوتے ہوئے بھی بیٹے کو تعلیم اور تربیت کے لیے ہم جاہلوں کے پاس لانے

کا فیصلہ کر چکے تھے۔ کیا اس لیے کہ آپ اسے اپنی طرح مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی شہری ماں پر جائے۔ آپ چاہتے تھے کہ اسے اپنی شہری ماں سے جو نسلی کمزوریاں ملی ہیں، وہ دور ہو جائیں۔ دب جائیں۔ آپ مانیں نہ مانیں، آپ شادی کر کے پچھتائے تھے۔ تبھی آپ نے یہ فیصلہ کیا تھا......

دوسری طرف نعمان شاہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکی یہی سوال کرے گی...... اور اسے برا لگے گا۔ کیونکہ یہ سچ تھا اور اس کا بیٹے کو یہاں لانا اور چھوڑ کر جانا اس کا ثبوت...... وہ متوقع نظروں سے لڑکی کو دیکھتا رہا۔ وہ کم عمر اور خوبصورت لگتی تھی لیکن اس کی آنکھیں اس تاثر کی نفی کرتی تھیں۔ اس کی سمجھداری کا تو وہ قائل ہو گیا تھا۔

"جو ماں...... بچوں کی تعلیم کا خیال رکھ سکے اور ان کی اچھی تربیت کر سکے، وہ پڑھی لکھی نہ بھی ہو تو......" جمیلہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ وہ کہتے کہتے رکی۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ "لیکن نہیں۔ بیوی کو پڑھا لکھا ضرور ہونا چاہیے۔"

نعمان نے اس کی بات سنی تھی اور وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔

"شاہ جی سرکار، چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر پھر بھی معاف کر دیجیے گا مجھے۔ میرے خیال میں آپ کو شادی کسی مقامی لڑکی سے ہی کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو حق ہے نا ہمارا، زمین کے ناتے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ نے شہر میں زندگی گزار کر بھی پہاڑ کی محبت نہیں چھوڑی اور آپ کی پہاڑ اور زمین سے محبت کوئی شہری لڑکی نہیں سمجھ سکتی۔"

نعمان شاہ سناٹے میں آ گیا۔ اتنی سی لڑکی اور اتنی بڑی بات! وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی۔ سو فیصد سچ۔ روبینہ اس کی زمین سے محبت کو کبھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ اس کے ہر سال یہاں آنے سے چڑتی تھی۔ اس لیے خود بھی کبھی یہاں نہیں آئی تھی......

"پاپا...... یہ لیجیے چائے۔" عمران نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ وہ چائے کی پیالی لیے کھڑا تھا۔

نعمان شاہ نے سکون کی سانس لی۔ عمران صحیح وقت پر آ گیا تھا۔ ورنہ یہ لڑکی جانے کیسے کیسے سوال کرتی۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے سوچتا رہا۔ آج اسے ماضی بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ زمین کی محبت! جمیلہ نے کیا کیا یاد دلا دیا تھا۔

معاملہ الٹا تھا۔ اس کے ابا نے اسے تعلیم کے لیے شہر بھیجا تھا۔ انہیں بڑا شوق تھا اسے تعلیم دلانے کا۔ کچھ یوں کہ وہ اکلوتی اولاد بھی تھا۔ امی کا انتقال اس وقت ہوا، جب وہ چھ سال کا تھا۔ امی کے انتقال کے فوراً بعد ہی ابا اسے شہر لے گئے تھے۔ انہوں نے ہوسٹل میں اس کے رہنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہفتے کی شام وہ گاڑی میں لے کر آتے۔ اتوار کا دن وہ گھر پر گزارتا۔ اتوار کی شام ابا اسے پھر ہوسٹل چھوڑ

آتے۔ پورے ہفتے وہ گھر کو بڑی شدت سے یاد کرتا۔ اس نے ایبٹ آباد پبلک اسکول اور پھر پبلک کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس تعلیمی ادارے میں ملک کے ہر بڑے شہر کے لڑکے موجود تھے۔ تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا۔ ہوسٹل میں بھی ہر طرح کا آرام تھا اور ہر طرح سے خیال رکھا جاتا تھا۔ ہوسٹل میں نعمان کا روم میٹ کراچی کا ایک لڑکا مسعود تھا۔ اس کے والد کا کراچی میں بڑا کاروبار تھا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ مسعود چھٹی گزارنے اس کے ساتھ ہی آجاتا۔ مسعود کا رجحان بھی کاروبار ہی کی طرف تھا۔ وہ اکثر کہتا...... یار تمہارے علاقے میں دست کاری کی صنعت بہت اچھی چل سکتی ہے۔ کچھ کرو اس سلسلے میں۔ کراچی میں بڑی مانگ ہے ان چیزوں کی لیکن نعمان بات ٹال جاتا۔ اس کی پوری توجہ پڑھائی پر تھی۔

سلیمان شاہ کا انتقال ہوا تو نعمان سترہ سال کا تھا اور بی کام فائنل میں تھا۔ اس کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ جیسے تیسے اس نے تعلیم مکمل کی۔ اس دوران مسعود نے اس سے کاروبار کی بات کی تو اس نے توجہ سے سنی۔ آئیڈیا واقعی اچھا تھا۔ علاقے میں کاریگروں کی کمی نہیں تھی۔ سید ہونے کے ناتے اور کچھ پرکھوں کی شرافت کی وجہ سے اس کی ایک ساکھ بنی ہوئی تھی۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ زمینوں کی کمی نہیں تھی۔ سلیمان شاہ کفایت شعار آدمی تھے۔ بیٹے کے مستقبل کی سوچتے تھے۔ سو کچھ نہ کچھ جوڑتے ہی رہتے تھے۔

مسعود چاہتا تھا کہ گریجویشن کرتے ہی اپنا الگ کاروبار شروع کر دے۔ اس نے مل کر کاروبار کی تجویز پیش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ نعمان یہاں چھوٹی سی انڈسٹری لگائے۔ دستکاری کے آئٹم تیار کرائے اور کراچی بھیج دے۔ وہاں مسعود اس سامان کو اپنی دکان پر رکھے گا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی نعمان اس سلسلے میں لگ گیا۔ ایبٹ آباد میں ان کا ایک بڑا پلاٹ تھا۔ اس پر تعمیر کرانے کے لیے معقول رقم موجود تھی۔ سو تیزی سے کام شروع کرا دیا گیا۔ یوں سادات ہینڈی کرافٹس کا افتتاح ہوا۔ ادھر زمینوں کی طرف سے بےفکری تھی۔ رب نواز کے آباؤ اجداد صدیوں سے ان کی زمین سنبھالتے آئے تھے۔

کاروبار کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اگرچہ منافع بہت کم تھا مگر نعمان کو اس بات کی خوشی تھی کہ اس سے بہت لوگوں کا روزگار بندھ گیا تھا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ پھر نعمان پہلی بار کراچی گیا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ مسعود کی کوئی دکان نہیں ہے۔ اس کے والد کا بہت بڑا دفتر ہے۔ وہ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔ نعمان ناسمجھ بچہ نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ ایکسپورٹ میں کتنا فائدہ ہے۔ سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات پر ہوا کہ اس کے ہنرمندوں کو اپنی محنت اور ہنر کے عوض صرف دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔ مسعود نے بات برابر کرنے کی بہت کوشش کی لیکن نعمان کا دل برا ہو چکا تھا۔

نعمان کراچی سے ایک فیصلہ کر کے آیا تھا لیکن اس پر عمل درآمد کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت تھی جو اس کے پاس نہیں تھا اور یہ فیصلہ وہ کر چکا تھا کہ اب شراکت کسی کے ساتھ نہیں کرے گا۔ آباؤ

اجداد کی زمینوں سے اسے بڑی محبت تھی مگر اب وہی اس کے کام آسکتی تھیں۔ زمین بیچنا اس کے نزدیک بہت برا تھا لیکن مجبوری تھی۔ تاہم اس نے ایک ایسا گاہک تلاش کیا، جس نے یہ وعدہ کر لیا کہ معقول منافع کے ساتھ وقت آنے پر وہ زمین دوبارہ اسے بیچ دے گا۔ سرمایہ میسر ہوا تو نعمان نے اپنے فیصلے پر عمل شروع کیا۔ کارخانے کو وسعت دی اور قالین بافی بھی شروع کروا دی۔ یہاں اعتبار کے آدمیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے صابر شاہ کو کارخانے کی ذمے داری سونپی اور خود کراچی چلا گیا۔ وہاں اس نے دفتر قائم کیا اور ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا۔ حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ مزدوروں کی اجرت پہلے ہی مرحلے میں دگنی ہوگئی تھی، بعد میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ ادھر اسے بھی منافع ملنے لگا۔ سب خوش تھے۔

اسے یاد تھا کہ اس نے صرف پانچ سال بعد اپنی زمین دگنی قیمت پر خرید لی تھی......

''کیا سوچ رہے ہیں پاپا؟'' عمران نے اسے چونکا دیا۔

''کچھ نہیں بیٹا۔ تم تیار ہو جاؤ۔ زمینوں پر چلیں گے۔'' اس نے کہا۔

☆☆☆☆☆

ریاض اور نیاز حیران بھی تھے اور خوش بھی۔ شاہ جی بابا اتنے عرصے کے بعد آئے تھے اور اس قدر اچانک۔ ننھا عمران حیران تھا۔ عزت کا یہ انداز اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو انہوں نے پاپا کے اور اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ پھر وہ پاپا کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ پاپا کے لاکھ کہنے پر بھی نہیں اٹھے۔

دیر تک وہ دونوں ادھر ادھر کا حال احوال سناتے رہے۔ کس کے گھر ماتم ہوا، کس کی شادی ہوئی، کس کے گھر بیٹے کی خوشی ہوئی، آج کل کون بیمار ہے، کس کا کس سے زمین کا تنازعہ چل رہا ہے، کس نے کس کے خلاف جرگہ بلوالیا ہے۔ باتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ رب نواز سامنے والی چارپائی پر بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا۔ اس دوران لسی سے ان کی تواضع کی گئی تھی۔ عمران کو یہاں کی لسی بہت پسند آئی تھی۔

اچانک ریاض نے نیاز کو اشارہ کیا۔ نیاز نعمان سے اجازت طلب کر کے اٹھا اور اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں رجسٹر تھا۔ اس نے رجسٹر نعمان کی طرف بڑھایا اور دوبارہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' نعمان نے پوچھا۔

''حساب کتاب ہے شاہ جی بابا۔ دیکھ لیں۔''

''دیکھنا کیا ہے۔''

''سرکار...... بیس سال کا حساب ہے۔ آپ نے تو نہ پلٹ کر دیکھا نہ دھیلا لیا اس میں سے۔'' ریاض نے گڑگڑا کر کہا۔

''بہت بوجھ ہوگیا شاہ جی بابا۔ ہلکا کر دیں۔ اب اٹھانا مشکل ہے۔'' نیاز منمنایا۔

''او بھئی میرا کیا ہے، اس میں۔'' نعمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کی دیکھ بھال کرتے ہو۔

تم محنت کرتے ہو تو یہ تمہارا حق ہوا نا۔ میں تو اس لیے زمین پر حق گاڑے بیٹھا ہوں کہ پرکھوں کی چیز ہے۔ ورنہ میں تو زمین ہی تمہارے نام کر دیتا۔''

''میں جانتا ہوں شاہ جی سرکار......'' ریاض نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''مگر جی حساب تو حساب ہوتا ہے۔ آپ کی امانت ہے یہ، اب لے لیں۔''

نعمان نے اب تک رجسٹر نہیں کھولا تھا۔ ''اچھا...... کتنا ہوگا۔ بتاؤ تو۔''

''وہ جی بیس سال کا حساب کم تو نہیں ہوتا۔ ہم تو اپنا حصہ لے کر کھاتے رہے ہیں۔ آپ کا اس رجسٹر میں لکھ دیتے ہیں اور بینک میں جمع کرا دیتے ہیں۔ اتنا حساب ہم کہاں جوڑ سکتے ہیں۔''

نعمان نے رجسٹر کھول کر دیکھا۔ واقعی لمبا حساب تھا۔ اس نے سرسری سا حساب لگایا۔ گیارہ لاکھ سے کچھ اوپر رقم بنتی تھی۔ ''تو یہ رقم بینک میں جمع ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں سرکار۔'' ریاض نے کہا۔ ''میرے بینک کے کھاتے میں جمع ہے آپ کی امانت۔''

''اچھا...... یہ بتاؤ، اپنی زمین کے لیے بھی کچھ کیا؟'' نعمان نے موضوع بدلا۔

''شاہ جی سرکار، آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں زمین کتنی مہنگی ہے۔ ہم بچت تو کرتے رہے ہیں لیکن اتنا تو نہیں ہوتا نا سرکار۔''

''یہ برابر والی زمین بھی سنا تھا، بک رہی ہے۔ کیسی زمین ہے؟''

''زمین تو اچھی ہے۔ پر بنارس خان پیسے بہت مانگتا ہے۔'' نیاز نے کہا۔

''کیا مانگتا ہے؟''

''سترہ لاکھ۔''

''تمہاری بچت کتنی ہے؟''

ریاض ہنسنے لگا۔ ''پچاس سال اور بچت کریں تو شاید زمین خریدنے کے قابل ہو جائیں۔''

''پھر بھی، ہاتھ میں کیا ہے تمہارے؟''

''پانچ لاکھ سے کچھ اوپر ہے۔''

''تو زمین خرید لو۔ بنارس خان والی۔ اپنی زمین کے ساتھ ہی ہے۔ تمہیں بھی آسانی رہے گی۔ میری زمین بھی سنبھالتے رہو گے۔''

''مگر سرکار کیسے......؟''

''بھئی...... یہ گیارہ لاکھ بھی ملا لو اور زمین خرید لو۔''

''نہیں سرکار...... یہ نہیں ہوگا۔'' رب نواز نے تیز لہجے میں کہا۔

''چاچا...... میں نے کہا نا کہ زمین پرکھوں کی یادگار نہ ہوتی تو میں اسے اب تک ریاض اور نیاز کے

نام کر چکا ہوتا۔'' نعمان نے کہا۔ ''میری آرزو ہے کہ ان کی اپنی زمین ہو اور یہ جو گیارہ لاکھ ہے یہ تو ان کی محنت کا ثمر ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن شاہ جی بابا......''

''یہ میرا حکم ہے۔'' نعمان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ ریاض کی طرف مڑا۔ ''وہ زمین خریدو اور دو ٹیوب ویل لگاؤ وہاں۔ رقم کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔''

ریاض اور نیاز کی خوشی دیدنی تھی۔ رب نواز سوچ رہا تھا کہ آج کے دور میں بھی وفاداری کا صلہ ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

جیپ کچے اور ناہموار راستے پر چل رہی تھی۔ جھٹکے بہت شدید تھے۔ رب نواز نعمان کو ادھر ادھر کے واقعات سنا رہا تھا۔ موقع ملتے ہی عمران نے پوچھا۔ ''پاپا...... اب گھر چل رہے ہیں نا؟''

''نہیں بیٹے۔ اب میں تمہیں تمہارا گھوڑوں کا فارم دکھاؤں گا۔'' نعمان نے کہا۔

''میرا؟ گھوڑوں کا فارم؟''

''ہاں بیٹے۔ وہاں گھوڑے پالے جاتے ہیں۔''

''سچ مچ کے گھوڑے؟''

''تو اور کیا۔''

عمران خوش ہو گیا۔ جانور اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ بھینسیں اور بکریاں تو وہ دیکھ چکا تھا۔ اب گھوڑے...... اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔

گھوڑوں کا فارم نعمان شاہ کا تازہ ترین کاروباری پروجیکٹ تھا۔ وہاں گھوڑوں کی پرورش کی جاتی تھی۔ ابھی تک اس کاروبار سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا لیکن یہ نعمان کا شوق تھا اور شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس فارم کا انتظام رب نواز کے بھتیجے محمود خان کے ذمے تھا۔ نعمان اپنی اس خوش بختی پر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اسے پہلے تجربے کے بعد ہمیشہ قابل اعتبار لوگ ملتے رہے۔ محمود خان بھی ان میں سے ایک تھا۔ گھوڑوں سے اسے عشق تھا اور گھوڑے ہی کی طرح وفادار بھی تھا۔

فارم دیکھ کر عمران خوش ہو گیا۔ فارم بہت بڑا تھا۔ وہاں چالیس سے زیادہ گھوڑے تھے۔ اونچے خاردار تاروں کی باڑھ سے گھری بہت بڑی چراگاہ تھی۔ بہت بڑا اصطبل تھا۔ وہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ نعمان کو دیکھتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ ایک نوکر دوڑا دوڑا گیا اور محمود خان کو بلا لایا۔ محمود خان بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے نعمان کا ہاتھ چوما۔ ''یہ میرا بیٹا ہے...... عمران۔'' نعمان نے کہا۔ محمود خان نے اس کا ہاتھ بھی چوما۔

''بہت عرصے بعد درشن دیئے شاہ جی بابا۔'' محمود خان نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''بس کچھ الجھنیں رہیں۔'' نعمان نے کہا۔ ''اور اس طرف کا حال سناؤ۔ کیسا چل رہا ہے کام؟''

"آپ کی دعا چاہیے سرکار۔ چالیس گھوڑے آرمی کو دیئے ہیں۔ مگر ایک چیز دکھانی ہے آپ کو۔ خوش ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔"

"خوش تو تم نظر آ رہے ہو۔"

"آئیں تو سرکار۔"

وہ انہیں اپنے ساتھ اصطبل میں لے جانا چاہتا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے نعمان سے کہا۔ "اچھا...... آپ یہیں ٹھہریں شاہ جی سرکار۔ میں ابھی آیا۔"

ذرا دیر بعد وہ اصطبل سے نکلا تو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچھیرے کو اٹھائے ہوئے تھا۔ زمین پر بیٹھ کر اس نے بچھیرے کو اتارا لیکن اسے خود سے لپٹائے رکھا۔ "ذرا دیکھیں تو شاہ جی سرکار۔" اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ "یہ اپنی اسی مشکی بچھیری کا بیٹا ہے، جو آپ کو بہت پسند تھی۔ میں نے اسے بادل سے لگایا تھا۔"

نعمان شاہ وہیں بیٹھ گیا۔ وہ بچھیرے کا معائنہ کر رہا تھا۔ بچھیرا اسے غیر معمولی لگ رہا تھا۔ وہ بالکل سیاہ تھا۔ صرف پیشانی پر سفید ہلالی نشان تھا۔ اس کی ٹانگیں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں، جس کی وجہ سے وہ کچھ بے ڈھنگا معلوم ہو رہا تھا۔ "اسے سیدھا کھڑا کرو محمود خان۔"

محمود خان نے ہدایت کی تعمیل کی۔ بچھیرے کی ٹانگوں کا لمبا پن نمایاں ہو گیا۔ "اس کی رفتار دیکھیں گے شاہ جی سرکار؟" محمود خان نے پوچھا۔

نعمان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ذرا چھوڑو اسے۔"

محمود خان نے بچھیرے کو چھوڑا اور اس کی پیٹھ پر ایک دھول جمائی۔ بچھیرا صحیح معنوں میں ہوا ہو گیا۔ اس کا دوڑنا بھی غیر معمولی تھا۔ اس کی رفتار میں عجیب سا بہاؤ اور ہمواری تھی۔

"محمود خان...... اس کا خاص خیال رکھنا۔"

"جو حکم سرکار۔"

ننھے عمران کو اس بچھیرے نے مسحور کر دیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا تھا۔ اب بھی اس کی نظر اس کے تعاقب میں تھی۔ نعمان نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے بیٹے کو دیکھتا رہا تھا۔ نعمان کو توقع تھی کہ بیٹا اس بچھیرے کو مانگے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد نعمان نے محمود خان سے کہا۔ "اب...... میں چلتا ہوں۔"

"بیٹھئے نا سرکار۔ اب کھانا کھا کر جایئے گا۔"

"نہیں بھئی، کھانا تو چاچی کے پاس ہی کھاؤں گا۔"

"ابھی تو رکیں گے؟"

"دو ایک دن تو ہوں ابھی۔"

"پھر آیئے گا نا؟"

"ایک بار تو ضرور آؤں گا انشاءاللہ۔" نعمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ واپسی کے سفر میں عمران خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں خلا میں کسی نقطے پر جمی تھیں۔ لگتا تھا، جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہے۔ نعمان اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ ٹیلی فون والے آ گئے۔ رب نواز کو حیرت ہوئی۔ نعمان نے وضاحت کی کہ وہ خود ڈویژنل انجینئر سے بات کر کے آیا تھا۔ یہ ٹیلی فون خاص طور پر نصب کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں اضافی اخراجات اس نے خود ادا کیے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ عمران سے رابطہ رہے اور عمران خود کو بالکل کٹا ہوا محسوس نہ کرے۔ نعمان نے لائن مین سے بات کی۔ اس نے یقین دلایا کہ دو دن کے اندر لائن دے دی جائے گی۔ عمران ٹیلی فون دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

نعمان بیٹھا رب نواز سے باتیں کر رہا تھا کہ جمیلہ آ گئی۔ "بابا...... میں نے آپ سے کچھ کہا تھا؟" وہ بولی۔ "بھول گئے کیا؟"

رب نواز کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ "نہیں...... بھولا تو نہیں ہوں۔ پر تو خود ہی کہہ دے نا شاہ جی بابا سے۔"

جمیلہ ہچکچا رہی تھی۔ "بابا......" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے؟" نعمان نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں شاہ جی بابا۔" رب نواز بولا۔ "بچی ہی ہے نا ابھی......" اس پر جمیلہ نے پرزور احتجاج کیا۔ نعمان سوچنے لگا کہ اس بچی کو بڑا بننے کا کومپلیکس کیوں ہے آخر۔ لیکن رب نواز جمیلہ کی سنی ان سنی کر کے اپنی کہتا رہا۔ "یہ آپ کو کہیں لے جانا چاہتی ہے۔ آپ چلے جائیں تو مہربانی ہوگی۔ یہ خوش ہو جائے گی۔"

حیرت سے نعمان کا منہ کھل گیا۔ "لے جانا چاہتی ہے؟ کہاں؟"

"دور نہیں شاہ جی سرکار۔ یہیں۔ اوپر۔" جمیلہ نے جلدی سے کہا۔

نعمان ہچکچا رہا تھا۔ "لیکن کیوں؟"

"یہ تو وہاں پہنچ کر ہی بتاؤں گی۔" جمیلہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

"چلے جایئے سرکار۔ ورنہ یہ جان کو آتی رہے گی۔"

"اچھا۔" نعمان بادل ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے نعمان نے پوچھا۔ "بس...... ہم دونوں......"

جمیلہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "نہیں۔ ننکے شاہ جی بھی ہوں گے۔ انہیں تو صبح ہی لے جاتی پر میں نے سوچ رکھا تھا کہ پہلے آپ کو دکھاؤں گی۔"

نعمان کو اشتیاق ہونے لگا۔لڑکی کا ہیجانی انداز بتاتا تھا کہ وہ کوئی بے حد حیران کن چیز دکھانے لے جارہی ہے۔مگر کیا...... وہ اندازے لگاتا اور انہیں مسترد کرتا رہا۔

گھر کے پچھواڑے والی پگڈنڈی پر ایک درخت کے نیچے عمران بیٹھا تھا۔انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے نعمان کی انگلی تھام لی۔جمیلہ آگے آگے چل رہی تھی اور وہ دونوں پیچھے تھے۔ پگڈنڈی ختم ہوئی تو اخروٹوں کے درخت کی ایک دیوار سی سامنے آگئی۔درخت ابھی چھوٹے تھے مگر جس انداز میں لگائے گئے تھے،اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں چوحدی کے طور پر لگایا گیا ہے۔

اندازہ درست ثابت ہوا۔جمیلہ دو درختوں کے درمیان سے گزر کر انہیں اندر لے گئی۔''یہ آپ کی ہی زمین ہے میرے سرکار۔'' جمیلہ نے کہا۔

اور نعمان واقعی حیران ہوا۔حد درجہ حیران۔اس زمین کو تو استعمال میں لانے کا خیال بھی کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔اونچی نیچی غیر ہموار زمین کا کیا مصرف ہوسکتا ہے۔

''کمال ہے بھئی...... واقعی کمال ہے۔''اس نے بے ساختہ کہا۔

''آپ اندر تو آئیں......'' جمیلہ نے کہا۔پھر وہ انہیں لیے لیے پھری۔''یہ دیکھیں،یہ آلو بخارے ہیں......اور یہ خوبانی......اور یہ لوکاٹ......اور یہ انار ہیں...... یہ سیب......اور یہ اخروٹ۔''

وہ بہت بڑا باغ تھا اور بڑی خوبصورت ترتیب میں لگایا گیا تھا۔آخر میں پھر اخروٹ کے درختوں کی دیوار تھی۔''درخت تو بہت بڑے ہوگئے ہیں۔''نعمان نے کہا۔

''بڑے کیا،اخروٹ کے سوا اس سیزن میں انشاءاللہ تمام درخت پھل دیں گے۔''

''کمال ہے بھئی۔''

''کوئی کمال نہیں ہے۔یہ سوچیں کہ آپ کتنے عرصے بعد آئے ہیں۔اتنے عرصے بعد کہ ننھے پودے درخت بن گئے اور پھل بھی دینے لگے۔''

اس کے لہجے میں دکھ تھا اور اپنائیت اور محبت بھری شکایت،جس نے نعمان کے دل کو چھولیا۔اس نے سوچا...... ہاں،میں بہت عرصے کے بعد آیا ہوں...... چار سال۔نہیں ٹھیک ساڑھے چار سال ہو گئے۔آنکھوں کے سامنے ہوں تو درختوں پر پھل آتے دیکھنے کی خواہش کتنی صبر آزما ہوتی ہے۔انتظار کتنا طویل ہوتا ہے۔

''اب اس باغ سے پہلا پھل آپ کو توڑنا ہے۔سیزن میں یہ سب درخت آپ کا انتظار کریں گے۔''جمیلہ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔اس بار نعمان کو احساس ہوا کہ لڑکی کے لہجے میں وہ احترام نہیں، جو یہاں اس کے لیے روا رکھا جاتا ہے۔یہ تو برابر والوں کا سا لہجہ تھا۔اسے اچھا لگا۔یہ لڑکی مختلف تھی۔ اس کی عزت اس انداز میں نہیں کرتی تھی،جس انداز میں اس کے ماں باپ اور علاقے کے لوگ کرتے تھے۔وہ سوچنے لگا۔ذرا سی تعلیم بھی انسان کو کتنا بدل دیتی ہے۔جاہلانہ عقیدت کی جگہ محبت بھری اپنائیت

کتنی اچھی لگتی ہے۔جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے مل رہا ہو۔''میں انشاءاللہ ضرور آؤں گا۔''

جمیلہ خوش ہوگئی۔''شکریہ شاہ جی سرکار۔''

وہ گھر واپس پہنچے تو رب نواز حقہ گڑگڑا رہا تھا۔''آپ نے تو کمال کر دیا۔رب نواز چاچا۔''نعمان نے گھر میں گھستے ہی کہا۔''اتنا خوبصورت باغ۔زمین کا یہ مصرف تو مجھے سوجھا بھی نہیں تھا۔''

''مجھے بھی نہیں سوجھا تھا شاہ جی بابا۔''رب نواز نے کہا۔''یہ تو میرا نہیں،صرف جمیلہ کا کمال ہے۔ دھی نے پودے منگوائے تھے مجھ سے۔بس وہ لا کر دیئے تھے میں نے۔چپکے چپکے یہ زمین تیار کرتی رہی تھی اوپر۔کھاد اس نے خود بنائی تھی ڈنگ زمین میں دفن کر کے۔ایک ایک پودا اسی کا لگایا ہوا ہے۔مجھے تو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا اس نے۔یہ تو پانچ سال پرانی بات ہے سرکار۔''

نعمان نے پلٹ کر دیکھا۔جمیلہ موجود نہیں تھی۔شاید وہ عمران کو لے کر باہر چلی گئی تھی۔وہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ پانچ سال پہلے اس نے جمیلہ کو دیکھا تھا تو وہ کتنی بڑی تھی۔اس کے تصور میں چھوٹی سی، گیارہ ساڑھے گیارہ سال کی بچی کی شبیہہ ابھر آئی۔تو کیا یہ بچی ابتدا ہی سے حیران کن ہے۔اس نے سوچا۔

☆☆☆☆☆

اگلی صبح نعمان شاہ چھ بجے اٹھ گیا۔یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی کہ اس کا بیٹا پہلے ہی اٹھ چکا ہے۔بچہ اس مسرت آمیز ہیجان سے دوچار تھا،جس سے بچے پہلے دن اپنے نئے اسکول جانے سے گزرتے ہیں۔ اسکول جاتے ہوئے رونے دھونے کے مرحلے سے وہ کراچی میں ہی گزر چکا تھا،جہاں اس نے نرسری کلاس میں پڑھا تھا۔وہاں بھی وہ چند روز بعد ہنسی خوشی اسکول جانے لگا تھا۔

نعمان نے جلدی جلدی تیاری کی پھر عمران کو تیار کرایا۔اس کے بستے میں کتابیں،کاپیاں،پنسلیں اور ربڑ رکھیں۔پھر پلاسٹک کے بڑے چار خانے والے لنچ باکس میں دو فرائی انڈے،مکھن کا ایک پیڑا، شہد اور ایک روٹی رکھی۔پانی کی بوتل بھری۔حالانکہ اس سردی میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔یہ دونوں چیزیں بھی اس نے بستے میں رکھ دیں۔بستہ کوہ پیماؤں والے تھیلے کی طرح تھا،جسے پشت پر باندھا جاسکتا تھا۔

جمیلہ یہ سب کچھ بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

عمران کو تیار کرانے کے بعد نعمان نے اسے خاص طور پر دیوار کی گھڑی دکھائی،جو وہ بطور خاص اپنے ساتھ لایا تھا۔''دیکھو بیٹے...... یہ گھڑی کی چھوٹی سوئی سیون پر اور بڑی ٹویلو پر ہو تو تمہیں اسکول کے لیے نکل جانا ہے۔دیر کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔کوشش کرو کہ اس سے پہلے ہی گھر سے نکل لو۔''

عمران نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔''ٹھیک ہے پاپا۔''

وہ باہر نکل آئے۔نعمان آہستہ چل رہا تھا۔وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اس کا اندازہ درست ہے۔وہ ڈھائی تین کلومیٹر کا پہاڑی راستہ تھا،جس میں چڑھائی بھی تھی اور ڈھلوانی بھی تھا۔وہ عمران سے کہتا رہا

کہ راستے کو اچھی طرح دیکھ لے اور شناختی علامتیں بھی ڈھونڈتا رہے۔ دو کلومیٹر چلنے کے بعد ڈھلوان شروع ہوئی۔ وہ پہاڑ سے اترے تو نیچے سڑک نظر آئی۔ نعمان نے گھڑی میں وقت دیکھا اور سڑک پر ایک سائیڈ میں کھڑی ہوئی سوزوکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تیز چلو بیٹے۔ یاد رکھو، یہ گاڑی ہر روز تمہیں اسکول لے جانے کے لیے یہیں آیا کرے گی۔ ڈرائیور آٹھ بجے تک تمہارا انتظار کرے گا۔ تم نہیں پہنچے تو آٹھ بجے وہ گاڑی لے کر چلا جائے گا۔ پھر تمہیں اسکول پیدل جانا پڑے گا۔''

وہ دونوں بھاگتے ہوئے اترے۔ وہ سرخ اور نیلے رنگ کی سوزوکی کیری تھی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر ان کے لیے دروازہ کھولا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ گاڑی چل دی۔

نعمان نے دانستہ طور پر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ وہ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ نعمان دراصل بچے کو وقت کی اہمیت ذہن نشین کرانا چاہتا تھا۔ ''بس بچ گئے بیٹے۔'' اس نے عمران سے کہا۔ ''ذرا سی دیر ہو جاتی تو گاڑی چلی جاتی۔''

''پھر کیا ہوتا پاپا؟''

''پھر اسکول پیدل جانا پڑتا۔ اسکول ساڑھے آٹھ بجے لگتا ہے۔ فاصلہ اتنا زیادہ بھی نہیں۔ پیدل پہنچنے میں تمہیں پندرہ منٹ لگیں گے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ گاڑی نہ نکلے۔'' نعمان نے کچھ توقف کیا پھر بولا۔ ''یہی گاڑی تمہیں اسکول سے واپس لائے گی اور اسی جگہ چھوڑے گی۔ یہاں سے پیدل گھر۔ گاڑی کا نمبر یاد کر لینا بیٹے۔''

وہ بیس منٹ پہلے اسکول پہنچ گئے۔ نعمان بیٹے کو ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں لے گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس نے عمران کی کلاس ٹیچر کو بلوایا۔ وہ بڑی پیاری سی، خوش اطوار لڑکی تھی...... مسکراتے چہرے والی۔ عمر بائیس تیئس سال ہوگی۔ ''مس نجمہ، یہ عمران ہے، جس کے متعلق میں نے کل آپ کو ہدایت دی تھی۔''

''جی سر، میں سمجھ گئی۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب عمران کی طرف مڑے۔ ''عمران...... یہ آپ کی ٹیچر ہیں مس نجمہ۔ آپ ان کے ساتھ چلے جائیں۔ کسی وقت کوئی بات ہو تو انہیں بتائیں یا میرے پاس چلے آئیں۔''

عمران کے جانے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے نعمان سے کہا۔ ''آپ بالکل فکرمند نہ ہوں جناب۔ آپ کا بیٹا یہاں بالکل محفوظ رہے گا۔ ہمارا اسٹاف ہر اعتبار سے تربیت یافتہ ہے۔''

''میرا کراچی کا فون نمبر آپ کے پاس ہے۔ یہاں کا فون نمبر کل پرسوں تک مل جائے گا۔ وہ بھی میں آپ کو دے دوں گا۔ کسی وقت کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک فون کر دیں۔ کال وڈ بی آن می۔''

''میں خود وقتاً فوقتاً آپ کو فون کرتا رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔''

نعمان اسکول سے نکل آیا۔ بچے اس وقت پلے گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے۔ عمران کھیل میں اتنا منہمک تھا کہ اس نے اسے نکلتے بھی نہیں دیکھا۔

باہر نکل کر نعمان نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بیس ہوئے تھے۔ سوزوکی کیری باہر کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ گیا۔ اسکول کی چھٹی ساڑھے بارہ بجے ہونا تھی۔ اتنی دیر میں صابر شاہ سے ملا جا سکتا تھا۔ اس سے کچھ اہم معاملات طے کرنا تھے۔ ''مجھے کارخانے لے چلو۔'' اس نے ڈرائیور سے کہا۔

راستے میں اُس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''تم پوری طرح سمجھ گئے ہو نا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

''آپ فکر نہ کریں شاہ صاحب۔''

☆☆☆☆☆

بارہ پچیس پر وہ اسکول پہنچا۔ ڈرائیور نے گاڑی پارک کی۔ وہ گاڑی سے اترا اور سڑک پار کر کے سامنے والے فٹ پاتھ پر جا کھڑا ہوا۔ پانچ منٹ بعد چھٹی کی گھنٹی بجی۔ اسکول کا دروازہ کھلا اور بچے باہر آنے لگے۔ کچھ کو گھر سے لینے کوئی آیا تھا لیکن زیادہ تر اسکول کی گاڑی میں جانے والے تھے۔

عمران باہر آیا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اپنی سوزوکی پہچان کر اُس کی طرف بڑھا۔ نعمان نے تیزی سے سڑک پار کی اور گاڑی تک پہنچا۔ اس وقت ڈرائیور عمران کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ عمران نے اسے دیکھا تو کھل اٹھا۔ سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد نعمان نے پوچھا۔ ''گاڑی کا نمبر یاد ہے بیٹے؟''

''جی پاپا۔ ٹو تھری فور سکس۔''

نعمان کو خوشی ہوئی۔ بچہ اہم باتوں کی اہمیت سمجھ بھی رہا تھا اور ان کے مطابق ضروری اقدامات بھی کر رہا تھا۔ ''اسکول کیسا لگا بیٹے؟''

''بہت اچھا پاپا''

''کچھ بچوں سے دوستی بھی ہوئی؟''

عمران نے شرمیلے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

سوزوکی نے انہیں اسی جگہ اتارا، جہاں سے وہ صبح اس میں بیٹھے تھے۔ اس بار گھر کے سفر کا آغاز چڑھائی سے ہوا۔ سردی کا احساس ہی نہیں رہا۔

''بھوک لگی تھی؟'' نعمان نے چلتے چلتے پوچھا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہاں بھوک بہت لگتی ہے پاپا۔''

نعمان مسکرایا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ خوب کھاؤ پیو، جان بناؤ۔ جب میں اتنا بڑا تھا تو ان راستوں پر بکری کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ منٹوں میں پہاڑ پر چڑھتا، منٹوں میں اترتا۔''

عمران کی آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ وہ بھی یہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اُس رات نعمان نے عمران سے کہا۔ ''بیٹے...... میں کل واپس جا رہا ہوں۔'' حالانکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا، وہ اس اسکرپٹ کے مطابق تھا، جو اُس نے یہاں آنے سے پہلے کراچی میں لکھا تھا۔

بچے کے چہرے پر شاک کا تاثر نظر آیا۔ ''ابھی سے پاپا...... ابھی تو دو دن ہوئے ہیں۔''

''بیٹے...... وہاں کام بھی تو ہیں۔''

''پپا...... تھوڑے دن...... بس تھوڑے دن اور رک جائیں۔''

نعمان سوچنے کی اداکاری کرنے لگا۔ ''کتنے دن بیٹا؟''

عمران نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''چار پانچ دن۔''

نعمان پھر سوچتا رہا۔ ''بیٹا...... اتنے دن میں تو میرا کافی نقصان ہو جائے گا۔'' اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔ ''اگر میں یہ نقصان برداشت کرلوں تو مجھے کیا ملے گا اس کے جواب میں۔''

''میں ہمیشہ آپ کو خوش کرنے کی کوشش کروں گا۔ جیسا آپ چاہتے ہیں، ویسا بنوں گا۔ مضبوط، بہادر اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والا، اچھا بیٹا۔''

''ایک بات اور۔ مجھے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہو گے۔''

''جی پاپا۔ میں روؤں گا بھی نہیں۔ کوشش کروں گا کہ آپ کو یاد بھی نہ کروں۔ یاد آئیں گے تو فون کرلوں گا آپ کو۔''

یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ سب کچھ توقع کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ نعمان کو سب سے زیادہ اس بات کا ڈر تھا کہ رخصت ہوتے وقت عمران کے آنسو اسے توڑ ڈالیں گے۔ اب اُس کا تدارک ہو گیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''تم چار پانچ دن کہہ رہے ہو۔ میں سات دن رک جاؤں گا مگر اپنا وعدہ نہ بھولنا۔''

''نہیں بھولوں گا پاپا۔'' عمران نے کہا اور لپٹ کر اسے پیار کرنے لگا۔

''اچھا...... اب سو جاؤ جا کر۔ صبح سویرے اٹھنا ہے۔''

عمران اسے سلام کر کے جمیلہ کے ساتھ چلا گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اُس نے پاپا کے ساتھ سونے کی ضد بھی نہیں کی۔ وہ اس میں خوش تھا کہ پاپا سات دن کے لیے ٹھہر گئے ہیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پاپا کو ہر حال میں سات دن یہاں رکنا تھا۔ وہ تو ان سات دنوں کے قیام کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار تھا۔

☆☆☆☆☆

اگلی صبح نعمان عمران کے اسکول کی تیاری میں لگنے والا تھا کہ جمیلہ نے اسے روک دیا۔ ''آج یہ کام آپ نہیں کریں گے۔''

نعمان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں کروں گی اور آپ دیکھیں گے۔ کوئی کمی نظر آئے تو ٹوک دیں۔'' جمیلہ نے کہا۔ پھر وضاحت

کی۔ ''دیکھیں نا شاہ جی سرکار، آپ چلے جائیں گے تو پھر یہ میری ذمے داری ہوگی نا۔ بعد میں تو کوئی ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔ مجھے اس وقت کے لیے تیار کر دیں۔ دو ہی تو دن ہیں اسکول کے۔''

نعمان نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں تھا۔ وہ ممنونیت بھری نظروں سے جمیلہ کو دیکھتا رہا۔ ٹوکنے کی نوبت نہیں آئی۔ جمیلہ نے نہایت خوش اسلوبی سے عمران کو اسکول کے لیے تیار کر دیا۔

مگر نعمان کو ابھی ڈرامے کے ایک اور ایکٹ کو پرفارم کرنا تھا۔ وقت کم تھا، اس لیے اسے تربیت کے اس ڈرامے کا ٹیمپو بہت تیز رکھنا پڑا تھا۔ اسے اپنی کل کائنات، اپنی زندگی کا سرمایہ یہاں چھوڑ کر جانا تھا۔ اس نے ہر طرح کے احتیاطی اقدامات کیے تھے لیکن مزید احتیاط کے طور پر وہ بیٹے کو بھی ہر ممکنہ حد تک تیار کر کے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ سات بجنے میں دو منٹ تھے کہ اس نے عمران سے کہا۔ ''بیٹے...... مجھے باتھ روم جانا ہے۔ میں ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔

دو منٹ بعد عمران نے باتھ روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے پکارا۔ ''پاپا...... سات بج گئے۔ جلدی کریں۔''

''ابھی آیا بیٹے۔''

عمران وہیں کھڑا رہا۔ ہر ایک منٹ کے بعد وہ اسے پکارتا۔ اُس کے لہجے کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ سات بج کر تین منٹ پر نعمان باتھ روم سے نکلا۔ ''سوری بیٹے۔ پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔'' پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ''ارے...... ہم تین منٹ لیٹ ہو گئے۔ خیر...... میرا خیال ہے تین منٹ سے زیادہ فرق تو نہیں پڑے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''معلوم نہیں پاپا۔ اب جلدی سے چلیں۔'' عمران پریشان لگ رہا تھا۔

دونوں باہر آ گئے۔ راستے میں نعمان بڑبڑاتا رہا۔ ہو سکتا ہے تین منٹ سے فرق نہ پڑے۔ تین منٹ ہوتے ہی کتنے ہیں لیکن نہیں، کسی وقت ایک منٹ سے بھی بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ بڑی غیر ذمے داری ہوئی ہے مجھ سے۔ تین منٹ لیٹ...... یہ تو بڑی غلطی ہے۔ خیر...... کوئی بات نہیں۔ غلطی کی ہے تو سزا بھی بھگتیں گے۔ آدمی غلطی کرے تو سزا سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ سزا سے تو حساب برابر ہو جاتا ہے۔ آدمی پر بوجھ نہیں رہتا۔ اور کیا پتا، ہم وقت پر پہنچ ہی جائیں۔ کیا پتا...... گاڑی کھڑی مل ہی جائے۔ خیر چھوڑو...... دیکھا جائے گا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ عمران بھی سن رہا تھا۔

''چلو بیٹے، تیز چل کر کوشش کریں۔ گاڑی مل جائے تو زیادہ بہتر ہے۔'' نعمان نے اسے اکسایا۔

دونوں تیز قدم چلتے رہے۔ ڈھلان پر پہنچتے پہنچتے ہانپ گئے۔ اوپر سے ہی نظر آ گیا کہ گاڑی موجود نہیں ہے۔ نعمان نے گھڑی دیکھی۔ ''ارے...... سوا آٹھ بج گئے۔ گاڑی تو جا چکی۔'' حالانکہ اس وقت آٹھ بھی نہیں بجے تھے اور ڈرائیور کو اس نے گزشتہ روز منع کر دیا تھا کہ گاڑی نہ لائے۔ البتہ دوپہر کو پہنچ جائے۔ یہ ہدایت صرف ایک دن کے لیے تھی۔

عمران کے قدم سست پڑ گئے تھے۔ چہرے پر مایوسی تھی۔ ''چلو...... اچھا ہوا۔ ہمیں دیر سے گھر سے نکلنے کی سزا مل گئی۔'' نعمان نے اُس سے کہا۔ ''اچھا...... اب تیز چلو۔''

''لیکن پاپا، اب تیز کیوں چلیں۔ گاڑی تو جا چکی ہے۔''

''بیٹے...... اسکول بھی تو پہنچنا ہے۔ اسکول دیر سے پہنچے تو سخت سزا ملے گی۔''

عمران کے قدم تیز ہو گئے۔ ''اسکول لگنے میں تو ابھی وقت ہے پاپا۔ ہے نا؟'' اس نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... ہے تو...... مگر بیٹے۔ جلدی پہنچنے میں نقصان نہیں، فائدہ ہے۔ جبکہ لیٹ ہو جائیں تو سزا ملتی ہے۔''

''جلدی پہنچنے کا کیا فائدہ ہے پاپا؟''

''اسمبلی تک کھیلنے کا وقت مل جاتا ہے۔'' نعمان نے سادگی سے کہا۔

دس منٹ میں وہ اسکول پہنچ گئے۔ اس وقت سوا آٹھ بجے تھے۔

☆☆☆☆☆

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد نعمان کو خیال آیا کہ گزشتہ روز اس نے عمران کی کاپیاں چیک نہیں کی تھیں۔ نہیں دیکھا تھا کہ اسے کیا ہوم ورک ملا ہے اور ہوم ورک اس نے کیا بھی یا نہیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ عمران کی تلاش میں نکلا۔ عمران جمیلہ کے کمرے میں تھا۔ نعمان نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ''میں اندر آ سکتا ہوں۔'' اس نے پکارا۔

ہڑبڑاتی ہوئی جمیلہ دروازے پر آئی۔ ''شاہ جی سرکار...... آیئے نا جی۔''

وہ اندر چلا گیا۔ اس کمرے میں میز اور کرسی موجود تھی۔ جمیلہ نے کرسی پر گدیاں ڈال کر اسے اونچا کر دیا تھا۔ عمران اس پر بیٹھا تھا۔ میز پر اس کی کاپیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سلام کیا۔ ''کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' نعمان نے پوچھا۔

''ہوم ورک کر رہا ہوں پاپا۔''

''کل ہوم ورک ملا تھا تمہیں؟''

''جی ہاں پاپا۔ میں نے کر بھی لیا تھا۔''

''مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔''

''جمیلہ باجی نے آتے ہی میری کاپیاں دیکھیں۔ پھر سامنے بیٹھ کر ہوم ورک کرایا۔ باجی کہتی ہیں...... اسکول سے آتے ہی ہوم ورک کر لیا کروں تو پھر بکریاں لے کر باہر جائیں گے۔ باجی کہتی ہیں...... کام پہلے نمٹا لینا چاہیے۔ پھر فرصت کا وقت اپنا ہوتا ہے۔ جو جی چاہے کر سکتے ہو۔''

نعمان نے سر گھما کر جمیلہ کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں ستائش بھی تھی اور ممنونیت بھی۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

جمیلہ نے نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میرے سرکار...... میں پڑھی لکھی تو نہیں ہوں لیکن اتنا خیال تو رکھ سکتی ہوں۔''

نعمان سناٹے میں آ گیا۔ بغیر کچھ کہے وہ کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆☆☆

اگلے دو دن میں بہت کچھ ہو گیا۔ جمعرات اسکول کا آخری دن تھا۔ پھر چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اب اسکول یکم مارچ کو کھلنا تھا۔ اگلے روز جمعے کو مولوی صاحب آ گئے اور بڑی سادگی سے عمران کی بسم اللہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے چھٹیوں کے دوران پڑھانے کا وقت دو بجے مقرر کیا۔ اسکول کھلنے کے بعد پانچ بجے کا۔ نعمان جمعرات کو اسکول سے آتے ہوئے مٹھائی لے آیا تھا۔ رب نواز نے اس خوشی میں اپنی ایک بکری ذبح کی تھی۔ اچھی خاصی دعوت ہو گئی۔

نعمان کے پاس اب چار دن تھے۔ پانچویں دن ۲۸ دسمبر کو اس کی واپسی تھی۔ یہ چار دن اس نے عمران کے ساتھ گزارنے کی کوشش کی۔ وہ ہر روز صبح کو اسے اس راستے پر لے جاتا، جس پر عمران کو اسکول جانا تھا۔ ''یار بیٹے...... اب تم مجھے راستہ دکھاؤ۔ تم مجھے لے کر چلو۔'' اس نے کہا۔ اسے خوشی ہوئی کہ عمران کے قدم کسی مقام پر بھی نہیں ٹھٹکے۔ وہ پورے اعتماد سے اسے وہاں تک لے کر گیا۔ یہ بات اطمینان بخش تھی لیکن نعمان یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ درمیان میں ڈھائی ماہ کی چھٹیاں ہوں گی اور پھر عمران پہلی بار اکیلا جائے گا۔

عمران کا زیادہ وقت جمیلہ کے ساتھ گزرتا تھا۔ چھٹیوں کے لیے جو ہوم ورک دیا گیا تھا، وہ اسے باقاعدگی سے تھوڑا تھوڑا کر رہا تھا۔ جمیلہ اسے روز کوئی نہ کوئی نئی جگہ دکھانے لے جاتی۔ وہ اسے ان پہاڑوں سے روشناس کرا رہی تھی۔ ۲۵ دسمبر کو برف باری ہو گئی۔ آسمان سے روئی کے گالے سے گرنے لگے۔ چار پانچ گھنٹے میں انہوں نے ہر چیز کو ڈھک کر رکھ دیا۔ درختوں کی پتوں سے محروم شاخیں، گھر کی چھت، پہاڑ اور زمین، سب سفید ہو گئے۔ عمران بہت خوش تھا۔ وہ جمیلہ کے ساتھ باہر گھومتا رہا۔ دونوں برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ پھر نعمان بھی باہر نکل گیا۔ اس درخت کے نیچے، جہاں جمیلہ اور عمران جا کر بیٹھتے تھے، اس نے ایک کافی بڑا اسنو مین بنایا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ اس نے اپنے نگینوں والے کف لنکس لگا دیے۔ شام کو برف باری رکی تو رب نواز، جمیلہ اور عمران چھت پر چڑھ گئے۔ چھت سے برف ہٹانا ضروری تھا۔ وہ برف گراتے رہے۔ اس وقت تک سردی زیادہ نہیں تھی۔ آسمان صاف تھا۔ ستارے نکلے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ رات کہرا پڑے گا۔ برف گلنے کی بجائے سخت ہو جائے گی اور سردی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

ہُوا بھی یہی۔ اس رات سردی زیادہ تھی۔ عمران معمول کے مطابق جلدی سو گیا۔ اگلے روز برف خاصی سخت ہو گئی تھی۔

۲۷ دسمبر کی صبح نعمان نے عمران کو یاد دلایا۔ ”بیٹے...... مجھے رکے سات دن ہو گئے۔“

”نہیں پاپا۔“ عمران کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

نعمان نے حساب کر کے اسے یاد دلایا۔ ”کل مجھے واپس جانا ہے بیٹے۔“

عمران اداس ہو گیا۔

”دیکھو عمران، وعدہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور پھر اسے پورا بھی ضرور کرتے ہیں۔“ نعمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ ہنسی خوشی مجھے رخصت کرو گے۔“

عمران زبردستی کی ہنسی ہنسنے لگا۔ ”تو پاپا...... میں رو تو نہیں رہا ہوں۔“

اس کی معصومیت پر نعمان کو بھی ہنسی آ گئی۔ ”چلو...... آج تمہیں میرے ساتھ گھومنے چلنا ہے۔“

”جمیلہ باجی کو بھی لے لوں۔“

”نہیں بیٹے، یہ مناسب نہیں۔“

راستوں پر برف ہونے کی وجہ سے نعمان نے احتیاطاً رب نواز کو ساتھ لے لیا۔

وہ گھوڑوں کے فارم پر پہنچ گئے۔ عمران کو حیرت ہوئی۔ پچھلی بار وہ جیپ میں یہاں سے گھر گیا تھا تو خاصی دیر لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فارم گھر سے بہت دور ہے۔ فارم پر قہوے کا دور چل رہا تھا۔ اس روز عمران کو پتا چلا کہ فارم کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان بھی ہے۔ اس میں فارم میں کام کرنیوالے رہتے تھے۔ محمود خان انہیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ ان کے لیے قہوہ لایا گیا۔ ”میں کل واپس جا رہا ہوں محمود خان۔“ نعمان نے کہا۔

”اتنی جلدی سرکار۔“

”پھر آؤں گا انشاءاللہ...... اور جلد ہی آؤں گا۔“

”ایک دن تو ہمارے پاس بھی رکتے سرکار۔“

”پھر سہی خان۔ اس وقت تو میں کام سے آیا ہوں۔“

”حکم کریں شاہ جی بابا۔“

”وہ بچھیرا لے آؤ ذرا۔“

”ابھی لیں۔“ محمود خان کمرے سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد بچھیرے کو لیے واپس آیا۔ ”حاضر ہے سرکار۔“

نعمان نے بچھیرے کے سر کو تھپتھپایا۔ ”بہت پیارا ہے یہ۔“ اس نے کہا اور سر گھما کر عمران کی طرف دیکھا، جو پچھلی بار کی طرح اب بھی سحر زدہ سا ٹکٹکی باندھے بچھیرے کو تکے جا رہا تھا۔

”محمود خان...... اس بچھیرے کا نام طوفان کیسا رہے گا؟“

”بہت اچھا شاہ جی بابا۔ آخر یہ بادل کا بیٹا ہے۔“

”بس تو اس کا نام طوفان ہے۔ اور آج سے یہ میرے بیٹے عمران کی ملکیت ہے۔“

”بہت بہتر شاہ جی سرکار۔“

عمران کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے نعمان کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ”پاپا...... پاپا...... کیا سچ......؟“

”بیٹے...... اچھے بچے جھوٹ تو نہیں بولتے نا۔ اور میں اچھا بچہ ہوں۔“ نعمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پاپا...... یہ...... یہ میرا ہے اب؟“

”ہاں بیٹے۔ یہ بڑا ہو جائے تو اس پر سواری کرنا۔ آج تمہاری سالگرہ کا دن ہے۔ یہ میری طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔“

”تھینک یو پاپا۔ میں اس پر ابھی سواری نہیں کر سکتا؟“

”نہیں بیٹے۔ تم بھی چھوٹے ہو اور یہ بھی۔ تمہیں سواری کرنا نہیں آتا اور اسے ابھی اپنی پیٹھ پر کسی کو بٹھانے کے آداب نہیں آتے۔ ہاں ایک کام کر سکتے ہو تم۔“ عمران اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”یہ محمود انکل گھوڑوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ اب تمہارے اسکول کی چھٹیاں ہیں۔ تم روز صبح کو ان کے پاس آ جایا کرو۔ یہ تمہیں گھوڑوں کے، گھڑ سواری کے بارے میں سب کچھ بتائیں گے، سکھائیں گے۔“

”ٹھیک ہے پاپا۔ میں روز آیا کروں گا۔“ عمران نے کہا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے بچھیرے کی تھوتھنی اپنے رخسار سے لگائی اور اسے سہلانے لگا۔ چند لمحے بعد بچھیرا بھی اس کے ہاتھ چاٹنے لگا۔

”اس نے تمہیں اپنا مالک مان لیا ہے بیٹے۔“ نعمان نے کہا۔ ”دیکھو۔ کیسے تمہارے ہاتھ چاٹ رہا ہے۔“

عمران بچھیرے کو بہت محبت سے دیکھتا رہا۔ بچھیرا بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”پاپا...... میں اسے ابھی گھر لے جا سکتا ہوں؟“

”نہیں بیٹے۔ پہلے تمہیں محمود انکل سے یہ سیکھنا ہو گا کہ گھوڑے کیسے پالے، کیسے رکھے جاتے ہیں۔ تبھی تو تم اس کے لیے اصطبل بنا سکو گے۔ یہ سیکھتے سیکھتے تم بھی بڑے ہو جاؤ گے اور یہ بھی۔ پھر تم اسے اپنے ساتھ لے جانا۔ اپنے ساتھ رکھنا۔“

عمران کی آنکھوں میں ایک لمحے کو مایوسی نظر آئی۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ ”اور اگر میں جلدی سیکھ لوں تو؟“

نعمان نے محمود خان کی طرف دیکھا۔ ”محمود خان، جب بھی تم یہ سمجھو کہ عمران اب گھوڑا پالنے اور

رکھنے کے قابل ہو گیا ہے، طوفان کو اس کے سپرد کر دینا۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے سرکار۔ لیکن ننکے شاہ جی چھٹیوں میں ہر روز یہاں آئیں گے۔''

''میں روز آؤں گا محمود انکل۔'' عمران نے وعدہ کیا۔

واپسی کے سفر میں عمران کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ جیسے بادلوں میں اڑ رہا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اچانک اس کے قدم سست پڑ جاتے۔ اپنے پچھیرے کو یوں چھوڑ کر آنا، اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ پاپا کی بات بھی درست ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ پسندیدہ چیز کے حصول کے لیے اس سے دور بھی ہونا پڑتا ہے۔ اہلیت بھی ثابت کرنا پڑتی ہے۔ اس کا ننھا سا ذہن بہت کچھ سیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ اس خوب صورت پچھیرے سے اسے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے اسی دن پاپا سے مانگ لینا چاہتا تھا......

''عمران...... تمہیں یہ پچھیرا پہلے دن ہی اچھا لگا تھا نا؟'' نعمان نے اچانک اس سے پوچھا۔

''جی پاپا۔'' عمران کو حیرت تھی کہ پاپا نے اس کے دل کی بات کیسے جان لی۔

''اور تم اسے اسی دن مجھ سے مانگنا چاہتے تھے۔ ہے نا؟''

''جی پاپا۔''

''تم نے اچھا کیا کہ اس دن کچھ نہیں کہا۔ ورنہ آج جیسی خوشی نہیں ملتی تمہیں۔''

''لیکن پاپا۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہ پچھیرا لینا چاہتا ہوں۔''

''بیٹے...... جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو اُس کے دل تک بھی پہنچ جاتا ہے۔'' نعمان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں تو یہ جاننا میری ذمے داری ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ کس وقت کون سی چیز کی ضرورت ہے تمہیں۔ محبت کرنا بڑا ذمے داری کا کام ہے بیٹے۔ اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے تو میں ایک ہفتہ رکا۔ اسی لیے میں نے یہ پچھیرا تمہیں مانگے بغیر دیا۔''

''تھینک یو پاپا۔''

''ایک بات بتاؤ بیٹے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

''جی پاپا۔''

''یہ جانتے ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں؟''

''جی پاپا۔ جانتا ہوں۔'' عمران نے کہا۔ ''اور پاپا، میں وہی کچھ کروں گا بھی جو آپ چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں، آپ ہمیشہ مجھ سے خوش رہیں۔''

''تھینک یو بیٹے۔'' نعمان نے کہا اور اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ اُس کے اپنے دل میں عجیب سی اداسی اور سناٹا پھیل گیا تھا۔ یہ تصور ہی اس کے لیے باعث تکلیف تھا کہ وہ بیٹے کو یہاں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ مگر اسے اپنی اداسی چھپا کر رکھنا تھی اور بیٹے کو اداسی سے بچانا تھا۔ ''بس تو بیٹے، تم اپنی ذمے

داری پوری کرنا۔'' اس نے اسے کندھے پر بٹھائے چلتے ہوئے کہا۔ ''کل میں چلا جاؤں گا۔ مگر تم یہی سمجھنا کہ میں تمہارے پاس ہوں اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں دور رہ کر بھی تمہارے پاس ہی ہوں گا۔ محبت میں یہ طاقت ہوتی ہے میرے بیٹے۔''

وہ آخری موقع تھا کہ عمران باپ کے کندھے پر بیٹھا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ جدائی کی رات تھی!

جمیلہ کروٹیں بدلے جا رہی تھی۔ اُس نے خود پر نیند طاری کرنے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ عمران سے لپٹ کر بھی نیند نہیں آ سکی تھی۔ دل و دماغ پر ایک عجیب سی بے چینی سوار تھی۔ کسی صورت قرار نہیں آ رہا تھا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس بار تو اسے مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ وہ اپنے پیچھے اپنے آنے کی ایک ضمانت چھوڑے جا رہا تھا۔ اپنی سب سے قیمتی چیز اور وہ صرف اس کے لوٹ کر آنے کی ضمانت نہیں، وہ ایک پُل تھا، جس کے ذریعے وہ اس تک پہنچ سکتی تھی۔ اس نے جھک کر برابر سوئے ہوئے عمران کا رخسار چوم لیا۔

پھر یہ بے چینی کیوں؟ اسے جیتنے کا ایسا امکان تو پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ ایسا موقع تو پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ پھر کیوں؟

اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ وہ بیٹے سے کتنی محبت کرتا ہے...... اسے چھوڑ کر جانا اس کے لیے کتنا مشکل ہو گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنے چہرے سے، انداز سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ مرد تو ایسے ہی ہوتے ہیں...... سخت جان۔ مگر اندر اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ تو اس کے لیے قیامت کی رات ہو گی۔ یہ بات اُس نے اپنے حوالے سے سمجھی تھی۔ وہ اُس سے محبت کرتی تھی۔ اور وہ یہاں مہمان آتا تھا۔ یہ گھر تو نہیں تھا اس کا۔ وہ واپس جانے کے لیے آتا تھا۔ اور وہ اس پر کوئی اختیار نہیں رکھتی تھی۔ اس پر کوئی حق نہیں تھا اُس کا۔ کوئی رشتہ نہیں تھا اُس سے۔ بس دل کا ہی تو رشتہ تھا، جسے کوئی نہیں مانتا۔ پر وہ جائے تو کیسا دکھ ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ چاہے بھی تو اسے نہیں روک سکتی تھی۔ تو اب اُس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ عمران تو اس کا بیٹا ہے۔ اُس پر اس کا اختیار ہے۔ وہ اس سے کیسے جدا ہونا چاہے گا۔ جب کہ وہ چاہے تو اسے اپنے ساتھ لے جائے، کون اسے روک سکتا ہے۔ تو پھر اس کی جدائی کا دکھ تو بڑا ہوا نا۔

کیا وہ اسے تسلی دے سکتی ہے؟ کیا اس یقین دہانی سے اسے کچھ قرار آ جائے گا کہ وہ اُس کے بیٹے کو خوش رکھنے کی کوشش کرے گی۔ ہر طرح اس کا خیال رکھے گی۔ کیا اس سے اسے کچھ فائدہ ہو گا؟ یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ مختصر سی کشمکش ہوئی اور بالآخر دل جیت گیا۔ اس نے جیکٹ پہنی، چادر اوڑھی اور عمران کو اچھی طرح لحاف اڑھانے کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ وہ اس کمرے کے دروازے سے کچھ

دور تھی، جس میں نعمان شاہ سو رہا تھا کہ ماں کی پکار نے اُس کے قدم ٹھہرا دیے۔ ''جمیلہ پتر...... کدھر چلی۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کمبل میں لپٹی ماں بڑی بے آرامی سے کرسی پر بیٹھی تھی۔

''ادھر آ پتر۔'' ماں کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

وہ پلٹی اور ماں کی طرف چل دی۔ یوں جیسے نیند میں چل رہی ہو۔

''بیٹھ جا بیٹی۔'' ماں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ ''کہاں جا رہی ہے ری۔''

''ماں...... وہ میں...... وہ...... ماں مجھے پیاس لگی تھی۔ پانی پینے اٹھی تھی میں۔''

''اس موسم میں اتنی رات کو پانی پینا ٹھیک نہیں دھیئے۔ پیاس پر صبر کر لیا کر۔''

جمیلہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ اُس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ لیکن روشنی اتنی کم تھی کہ وہ اُس کے چہرے کا تاثر نہ پڑھ سکی۔

''اس طرح پانی پیئے گی تو بار بار اٹھنا پڑے گا۔ سو نہیں سکے گی رات بھر۔''

''ماں، تو سوئی کیوں نہیں۔ یہاں کیوں بیٹھی ہے؟'' جمیلہ نے پوچھا۔

بڈھی کلثوم انگلیوں پر کچھ گننے لگی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ ''مجھے تو آج دس راتیں ہو گئیں جاگتے۔''

جمیلہ کا دل بے طرح دھڑکا۔ یہ کیا کہہ رہی ہے ماں۔ دس دن! دس دن تو نعمان شاہ کو آئے ہوئے تھے۔ تو کیا ماں کو معلوم ہے۔ ''لیکن کیوں ماں؟'' اس نے پوچھا۔

''بس، نیند نہیں آئی پتر۔ پتا ہے، میں بھی چاند کو اپنی جھولی میں بھر لینا چاہتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہے ماں؟'' جمیلہ کو تشویش ہونے لگی۔ اس نے ماں کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ مگر اسے بخار تو نہیں تھا۔

کلثوم اس کی پریشانی سے بے نیاز اپنی کہتی رہی۔ ''پتا ہے دھیئے، آدمی ساری عمر چاند کو جھولی میں بھرنے کی آرزو کرتا ہے...... ساری عمر! ایک عمر ہوتی ہے کہ اپنے لیے۔ اس وقت اسے کوئی کتنا ہی سمجھائے کہ یہ نہیں ہو سکتا، وہ نہیں مانتا۔ پھر وہ اپنے بچوں کے لیے چاند کی آرزو کرتا ہے۔ تب وہ بڑا ہو چکا ہوتا ہے۔ جانتا بھی ہے اور مانتا بھی ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی آرزو نہیں چھوڑتا۔ اور اللہ پاک بہت عمر دے تو بچوں کے بچوں کے لیے بھی وہ کھلونا چاند کا ہی مانگتا ہے۔ مجھ جیسے بے وقوف کم ہی ہوتے ہیں دھیئے۔ زیادہ لوگ ایک بار سمجھ لیں تو پھر چاند کو بس دل میں بھر لیتے ہیں۔ یہ ان کا حق ہوتا ہے۔ اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس سے اندر اجالا ہو جاتا ہے۔ لیکن ضدی بچے، بچے اندھیرے میں ہی رہتے ہیں...... مجھ جیسے۔''

''ماں...... یہ کیسی باتیں کر رہی ہے تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟''

''میں تجھے یہ بتا رہی ہوں پتر کہ جب میں تیرے جتنی تھی تو میں نے بھی تیری طرح چاند کو جھولی

میں بھرنا چاہا تھا۔ تو بھی یہی چاہتی ہے نا؟ پر چاند تو دور ہی رہا۔ اب میں تیری ماں ہوں اور اب پھر چاند کی آرزو میں تیرے ساتھ ہوں۔ اپنے لیے نہیں تیرے لیے۔ پر تو ناسمجھ ہے اور میں سمجھدار۔ اسی لیے راتوں کو جاگتی ہوں۔''

''ماں...... مجھے تیری کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے......''

''میں جانتی ہوں۔ مگر سمجھاؤں گی ضرور۔ دیکھ دھیئے، دور سے چاند اتنا چھوٹا لگتا ہے کہ مٹھی میں بند کر لو۔ جھولی میں بھر لو اسے۔ پر اب تو پتا چل گیا ہے کہ چاند بہت بڑا ہے...... زمین جیسا۔ ہم چھوٹے لوگ نہ چاند کو مٹھی میں لے سکتے ہیں، نہ جھولی میں بھر سکتے ہیں۔ ہم اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم تجھ سے عشق کرتے ہیں۔ ہمارے پاس آ جا۔ اس لیے نہیں کہ ہماری بات جائے گی اور ہماری بے عزتی ہوگی۔ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں چاند کی بے عزتی ہے۔ اور چاند کی بے عزتی کی ہمیں اجازت نہیں۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ہاں کبھی اللہ نصیب اچھا کر دے اور چاند ہم سے کہے کہ آؤ...... میرے سینے پر اپنا ایک گھر بنا لو اور اس میں رہو تو کس میں انکار کی ہمت ہے۔ یہ تو عزت کی بات ہوئی نا۔ ہاں ہم دعا کر سکتے ہیں اللہ سے کہ چاند اتر کر ہمارے پاس آئے اور ہمارے گھر کو اپنے سینے پر رکھ لے۔ دعا قبول ہونے تک ہم اس کی چاندنی دل میں اتار سکتے ہیں۔ دعا نہ قبول ہو تو اس کی چاندنی تو رہے گی نا ہمارے پاس۔''

اس بار جمیلہ ماں کا ایک ایک لفظ سمجھ رہی تھی اور شرم سے زمین پر گڑی جا رہی تھی۔ ''ماں...... تو غلط سمجھ رہی ہے۔''

''نہیں پتر! میں ٹھیک سمجھی ہوں۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ تو ایسی ویسی نہیں، پر چاند کی دیوانی تو ہے۔ اور دیوانوں سے گستاخی کا ڈر رہتا ہے۔ دیکھ، چاند بھی تو ایک داغ لیے پھرتا ہے۔ چاند بھی آدمی کی طرح کمزور ہوتا ہے۔ گھٹتا بڑھتا ہے، آدمی کے ایمان کی طرح۔ میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔''

''ماں...... مجھے نیند آ رہی ہے......''

''ادھر دیکھ...... میری طرف۔ تیری آنکھوں میں تو نیند کا ایک تار بھی نہیں۔ دیکھ بیٹی۔ میں تجھے کیسے کیسے سمجھا رہی ہوں۔ دھیئے، کچی عمر کی لڑکی اس شیش ناگ کی طرح ہوتی ہے، جس کے پاس منکا ہوتا ہے۔ منکے والے شیش ناگ بڑے کھلنڈرے ہوتے ہیں۔ اندھیری رات ہوتی ہے تو ان کا دل کھیلنے کو مچلتا ہے۔ وہ کسی ویرانے میں نکل جاتے ہیں۔ خواہش وہ تنہائی کی کرتے ہیں مگر ظاہر میں۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی کسی ویرانے میں بھی نہیں ہوتی۔ کوئی نہ کوئی دیکھنے والا ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ دیکھنے والا موجود نہ ہو تو کھیلنے کا کیا مزہ۔ تو شیش ناگ ویرانے میں پہنچ کر اپنا منکا اگلتا ہے۔ منکے کی روشنی اتنی ہوتی ہے کہ نظر کی حد سے آگے تک سب کچھ روشن ہو جاتا ہے۔ شیش ناگ پہلے منکے کے قریب قریب کھیلتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ منکا کھو گیا تو اس کے لیے موت ہی رہ جائے گی۔ پھر آہستہ آہستہ

اس کا ڈر نکلتا ہے تو وہ کھیلتا ہوا دور نکلنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو بہت دور نکل جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی منکے پر گوبر ڈال دے، کوئی تماشا دیکھنے والا اس پر کانوں والا تو ارکھ دے تو؟ کیا گوبر تو بڑی گندی چیز ہے دھیئے۔ اندھیرا کر دیتا ہے۔ ہاں...... اس کے گوئے بنا کر سکھا لو تو روشنی کرتا ہے۔ لیکن کچے گوبر سے تو بچنا چاہیے پتر۔'' کلثوم کی گفتگو بے ربط ہوئی جارہی تھی۔ جمیلہ کو اس کا لہجہ ہذیانی لگ رہا تھا۔ ''منکا تو پاک رہتا ہے۔ پر اس کی روشنی گوبر کے پار تو نہیں آتی۔ منکا ایک بار چھن جائے...... گوبر تلے دب جائے تو دوبارہ نہیں ملتا۔ اور منکا نہ ملے تو شیش ناگ نہیں جیتا۔ سر پٹک پٹک کر مرجاتا ہے دھیئے۔''

وہ خاموش ہوئی تو گہرا سناٹا چھا گیا۔ ماں بیٹی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر ماں نے ہی سکوت توڑا۔ ''جمیلہ پتر، مجھ سے وعدہ کر کہ رات کے وقت کبھی اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔''

''تو بےفکر ہو جاماں۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''جا کے نماز پڑھ بیٹی اور جو چاہے، اپنے رب جی سے مانگ میں بھی وضو کرنے جارہی ہوں۔ اللہ سے دعا کروں کی۔ چاند مجھے نہیں ملا تو میری بیٹی کو تو مل جائے۔ جا بیٹی۔'' جمیلہ پلٹی اور کمرے کی طرف چل دی۔ اسے فکر تھی کہ عمران جاگ نہ گیا ہو۔ بستر میں اسے نہیں پائے گا تو کتنا پریشان ہوگا۔

☆☆☆☆☆

وہ صبح جدائی تھی!

ننھے عمران شاہ کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس لمحے اسے کئی باتوں کی آگہی حاصل ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ وعدہ کرنا کتنا آسان ہے اور اسے نبھانا کتنا دشوار۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہر چیز جیسے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ ایک دن اس نے جگ میں سے پانی انڈیلا تو گلاس کو لبالب بھر لیا تھا۔ اس کی گورنس مس عائشہ نے اسے سمجھایا تھا۔ ''دیکھو عمران، گلاس میں اتنا پانی کبھی نہیں بھرنا چاہیے۔ گلاس چھلک جاتا ہے اور پانی گر جاتا ہے۔''

''لیکن مس...... پانی تو نہیں گرا۔ دیکھ لیں۔'' اس نے کہا تھا۔

مس عائشہ غصہ بھی نہیں کرتی تھی۔ غصہ آتا تو بس اُن کے ہونٹ بھینچ جاتے اور آنکھیں چھوٹی ہو جاتیں۔ اُس کا جواب سن کر بھی یہی ہوا تھا۔ ''ابھی تم گلاس کو لیے بیٹھے ہو اس لیے پتا نہیں چل رہا۔ اب اپنی بات ثابت کرو۔ اپنی جگہ سے اٹھو۔ دروازے تک جاؤ اور پھر واپس آکر یہیں بیٹھو۔ اور ہاں...... پانی ایک قطرہ بھی نہ گرے۔''

اس نے وہ چیلنج کھیل سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ مگر اُٹھتے اُٹھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غلطی پر تھا اور مس عائشہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ قدم بڑھانا بھی دوبھر تھا۔ وہ چار قدم چل کر ہی ہار گیا تھا۔

اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ پانی سے لبالب گلاس لے کر چلنا اور پانی کو چھلکنے سے بچانا پھر

آسان ہے۔ لیکن آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر جائیں تو انکو چھلکنے سے روکنا بہت مشکل ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے یوں بھری ہیں کہ پلکیں جھپکیں تو آنسو نکل پڑیں گے۔

نعمان شاہ نے اپنے بیٹے کی آنکھوں کو صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ اُس کے بعد دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُس کا اپنا سینہ آنسوؤں سے جل رہا تھا۔ لیکن چار سالہ بیٹے کے ضبط نے اسے بڑا سہارا دیا۔ عمران کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اسے حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔ اُس کا بھرم رکھنا ضروری تھا۔

گھر سے نکلتے وقت نعمان شاہ نے کلثوم کو سلام کیا۔ کلثوم نے اس کا ہاتھ چوما اور دعائیں دیں۔ نعمان نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''چاچی...... جمیلہ نظر نہیں آرہی ہے۔''

''گھر میں نہیں ہے۔ کہیں باہر نکل گئی شاید۔ آئے گی تو روئے گی کہ شاہ جی بابا کو خدا حافظ بھی نہیں کہا۔''

''اسے دعا کہیے گا میری طرف سے۔ خدا حافظ چاچی۔''

رب نواز آگے تھا اور نعمان اور عمران پیچھے تھے۔ نعمان نے عمران کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ دونوں سر جھکائے چل رہے تھے۔ ''یار بیٹے، تم نے تو کمال کر دیا۔'' نعمان نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے فخر ہے تم پر۔ کیسا وعدہ نبھایا ہے تم نے۔ تم تو میری توقع سے زیادہ بہادر ثابت ہوئے ہو۔''

عمران نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خوش تھا کہ پاپا نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔

''مگر وعدہ میرے جانے کے بعد بھی یاد رکھنا۔'' نعمان نے کہا۔ ''میں گھر پہنچتے ہی تمہیں فون کروں گا۔''

''جی پاپا۔'' عمران نے بمشکل کہا۔ اسے لگتا تھا کہ ایک لفظ بھی زور سے بولا تو اس کے آنسو بہہ نکلیں گے۔

اب وہ گیراج تک پہنچ گئے تھے۔ نعمان نے چابی نکال کر دروازہ کھولا، جیپ باہر نکالی اور دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر وہ بیٹے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا۔ بیٹے کی پیشانی اور رخساروں کو چومتے ہوئے اسے ایک بار پھر بیٹے کی آنکھوں میں لبالب بھرے آنسو نظر آئے۔ اس نے سوچا، یہ تو معجزہ ہے کہ اب تک ایک آنسو بھی نہیں نکلا۔ ''خدا حافظ بیٹے۔'' اُس نے دھیرے سے کہا۔ ''فی امان اللہ۔''

عمران کے لب ہلتے دکھائی دیے لیکن آواز سنائی نہیں دی۔ مگر نعمان نے ہونٹوں کی وہ جنبش پڑھ لی تھی۔ عمران نے جواباً خدا حافظ کہنے کے بعد اسے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ پھر اُس نے رب نواز کو سلام کیا۔ رب نواز نے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ نعمان جیپ میں بیٹھا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور ڈھلوان پر چل دی۔

جیپ کے چلتے ہی عمران پلٹ کر پگڈنڈی پر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جلد از جلد کمرے میں پہنچ کر منہ چھپا کے رونا چاہتا تھا۔ اس نے جیپ کے رکنے کی آواز نہیں سنی، جو ڈھلان کے فوراً بعد موڑ پر روک دی گئی تھی۔ اسے نہیں پتا چلا کہ باپ کا ضبط بھی جواب دے گیا ہے اور وہ اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے رو رہا ہے۔

دوبارہ جیپ بیس منٹ بعد اسٹارٹ ہوئی۔

وہ جیسے پانی میں تیرتا ہوا گھر پہنچا۔ کلثوم سامنے کہیں نہیں تھی۔ وہ سیدھا جمیلہ کے کمرے میں گھسا۔ تخت کے پاس پہنچ کر اس نے اندھا دھند لحاف اٹھایا اور اس میں گھس کر رونے لگا۔ ایسے کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ذرا دیر بعد اسے احساس ہوا کہ لحاف کے اندر ہچکیوں سے لرزتا ہوا ایک اور جسم بھی ہے۔ اس کا رونا موقوف ہو گیا۔ ''باجی......'' اس نے پکارا۔

جمیلہ کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ اس کی آواز سن کر جمیلہ پلٹی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لحاف کے اندر کے اندھیرے میں بھی وہ ایک دوسرے کے آنسوؤں سے تر چہروں کو دیکھ سکتے تھے۔

''عمران...... تم رو رہے ہو؟''

''باجی...... آپ بھی رو رہی ہیں۔''

جمیلہ نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''میرا تمہارا دکھ ایک ہے چاند۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''جس کی جدائی میں تم رو رہے ہو، مجھے بھی اسی کی جدائی رلا رہی ہے۔''

''تو کیا آپ بھی پاپا سے محبت کرتی ہیں؟'' بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

''میں بس تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''پاپا سے بھی کیا کریں۔''

پاپا سے کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ جمیلہ نے دل میں کہا۔ ان سے تو محبت ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

زندگی معمولات میں جکڑ کر رہ گئی تھی۔ عمران صبح سویرے اٹھتا۔ مرغیاں کھولنے، بھینسوں کو چارا ڈالنے میں جمیلہ کی مدد کرتا۔ ناشتے کے بعد وہ دونوں باغ میں چلے جاتے۔ عمران کو بڑی آرزو تھی کہ وہ درختوں پر پتے نکلتے دیکھے۔ وہ کسی شاخ پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا اور تکتا رہتا۔ اسے امید تھی کہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شاخ پر پتے نکلنے لگیں گے۔

واپس آتا تو وہ گھوڑوں کے فارم چلا جاتا۔ ابتدا میں رب نواز اسے لے کر گیا تھا۔ مگر اب اس نے راستہ سمجھ لیا تھا اور اکیلے ہی چلا جاتا تھا۔ فارم جانا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہاں کا ماحول اسے بہت پسند تھا۔ اس کا زیادہ وقت طوفان کے ساتھ گزرتا۔ یا پھر وہ گھوڑوں کو سدھانے کا منظر دیکھتا رہتا۔ فارم سے واپس آ کر وہ کھانا کھاتا۔ پھر تھوڑی دیر لیٹتا۔ کلثوم کہتی تھی، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد لیٹنا ضروری ہے۔ چاہے پندرہ منٹ کے لیے لیٹو۔ اٹھتا تو ذرا دیر بعد مولوی صاحب آ جاتے۔ ان سے پڑھ کر فارغ ہوتا تو

جمیلہ اس کے اسکول کا ہوم ورک لے کر بیٹھ جاتی۔ اس کام سے نمٹتے تو چار بج چکے ہوتے۔ جمیلہ اور وہ بکریوں کو لے کر کھیت سے اس طرح نکل جاتے۔ بکریوں کے چرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ پہاڑ پر اچھلتی کودتی پھرتیں۔ جمیلہ کہتی تھی بکری چلے پھرے نہیں تو سوکھ جاتی ہے۔

چار بجے یہاں شام ڈھلنے لگتی تھی۔ پانچ سوا پانچ بجے اندھیرا ہو جاتا تھا۔ اور رات اتنی تیزی سے آتی تھی کہ کبھی کبھی عمران گھبرا جاتا کہ اس نے رات کو آتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ ''ایسے ہی درختوں پر پتے بھی آ جائیں گے۔'' جمیلہ کہتی ''سو کر اٹھو گے تو حیران ہو جاؤ گے۔''

''مگر کیوں؟ یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آتا؟''

''بس یہاں ہر کام ایسے ہی ہوتا ہے...... چپکے سے۔ پلک جھپکتے ہیں۔ یہ ہزارہ ہے نکے۔ ہزاریت کے ہزار رنگ۔ اور ہزار رنگ تو حیران کرنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔''

ہفتے میں ایک بار نعمان کا فون ضرور آتا۔ کبھی دو بار بھی آ جاتا۔ وہ فون ہمیشہ صبح سویرے کرتا تھا۔ ان کے درمیان دیر تک باتیں ہوتیں۔ عمران کو بات کرتے ہوئے لگتا کہ پاپا اس کے سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ تصور میں انہیں دیکھتا رہتا۔ بات ختم ہوتی تو وہ کچھ دیر اداس رہتا۔

دن بھر کی مصروفیت کے بعد تو ویسے ہی پیاری نیند آتی ہے۔ اور پھر نیند بچے کی ہو تو کیا کہیے۔ اب اکثر ایسا ہوتا تھا کہ عمران کی آنکھ خود سے نہ کھلتی۔ جمیلہ اسے جگاتی۔

وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔

وہ دن عمران کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا، جب وہ چاچا رب نواز کے ساتھ پہلی بار گھوڑوں کے فارم پر گیا تھا۔ محمود خان چراگاہ میں ایک گھوڑے کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چابک تھا اور دوسرے میں لگام۔ وہ چابک کو بار بار لہرا رہا تھا۔ خوف ناک شائیں شائیں کی آواز نکل رہی تھی۔ گھوڑا چیخنے کے انداز میں ہنہناتا اور دو پیروں پر کھڑا ہو جاتا۔ محمود خان پھر چابک مارتا تو گھوڑا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوتا۔ خاصی دیر تک یہی کچھ ہوتا رہا۔ محمود خان نے لگام دانتوں میں دبالی تھی۔ ایک موقعے پر وہ اچھلا اور گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ گھوڑے کی گردن پر مضبوطی سے ڈال دیے تھے۔

گھوڑا محمود خان کے بیٹھتے ہی یوں اندھا دھند بھاگا، جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک دم یوں مڑتا، جیسے محمود خان کو گرانا چاہتا ہو۔ اور محمود خان کئی بار گرتے گرتے بچا۔ عمران کو بھی محمود خان کی مہارت کا احساس ہونے لگا۔ گھوڑا تیزی سے دائیں جانب مڑتا تو محمود خان پھرتی سے خود کو بائیں جانب کر لیتا۔ گھوڑا بائیں جانب مڑتا تو محمود خان دائیں جانب ہو جاتا۔ بالآخر گھوڑے کی رفتار سست ہو گئی۔ محمود خان نے اس کے منہ میں لگام ڈالی۔ پھر اس نے بیلٹ میں اڑسا ہوا چابک نکال لیا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑا محمود خان کے اشاروں پر چلنے لگا۔ چراگاہ کا پورا ایک چکر لگانے کے بعد محمود خان نے لگام کھینچی اور گھوڑا رک گیا۔ محمود خان کر نیچے اترا۔ اس نے پیار سے گھوڑے کا منہ تھپتھپایا اور اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

محمود خان باہر آیا۔ عمران نے اسے سلام کیا۔ ''آ گئے چھوٹے شاہ جی۔'' محمود خان نے سلام کا جواب دیا۔ ''میں سمجھا تھا، آپ نہیں آئیں گے۔''

''میں تو روز آؤں گا۔'' عمران نے کہا۔

''بالکل آئیں گے۔ بڑے باپ کے بیٹے ہیں نا۔''

عمران کو اس کے لہجے میں احترام محسوس ہوا۔ اس کا سینہ فخر سے بھر گیا۔ اس علاقے میں ہر کوئی پاپا کی عزت کرتا تھا۔ گزشتہ روز وہ رب نواز چاچا کے ساتھ کچھ سودا لینے ساتھ والے گاؤں گیا تو راستے میں جو بھی ملا، اس نے اس کے متعلق پوچھا۔ رب نواز نے بتایا تو سب نے اس کا ہاتھ چوما۔ ''پیروں کا بیٹا ہے۔'' سب نے یہی کہا۔ ''نعمان شاہ تو ولی ہے ولی۔''

محمود خان اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ ''بیٹھیں نکے شاہ۔ کچھ کھائیں گے...... پئیں گے؟''

''میں گھر سے ناشتا کر کے چلا ہوں۔'' عمران نے بے حد وقار سے کہا۔

محمود خان ہنسنے لگا۔ ''اچھا قہوہ پئیں گے۔''

''جی...... قہوہ پی لوں گا۔''

محمود خان نے نوکر سے قہوہ لانے کو کہا پھر عمران کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اپنے طوفان سے ملنے آئے ہیں؟''

''نہیں۔ آپ سے گھوڑوں کے متعلق سیکھنے آیا ہوں۔ طوفان سے بھی مل لوں گا۔''

''بہت خوب۔ بہت خوب۔ شاگرد بنیں گے میرے؟''

''جی ہاں۔ پاپا نے یہی کہا تھا۔'' عمران نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ مجھے گھوڑے پر سواری کرنا سکھائیں گے؟''

''ضرور۔ کیوں نہیں۔ مگر پہلے کچھ دن میں آپ کو گھوڑوں کے متعلق زبانی بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے انکل۔ ایک بات بتائیں، یہ آپ میدان میں کیا کر رہے تھے؟''

''میدان نہیں، وہ چراگاہ ہے۔'' محمود خان نے کہا۔ ''میں گھوڑے کو سدھا رہا تھا۔''

''سدھانے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''گھوڑے کو اپنی ہر بات سمجھنے کی اور اشارے پر چلنے کی تربیت دینا۔''

''تو گھوڑے کو مارنا تو نہیں چاہیے۔'' عمران نے کہا۔ ''انکل...... یہ چابک تو بہت زور سے لگتا ہو گا۔''

''ہاں...... بہت زور سے لگتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے۔ ہاں جب گھوڑا سدھ جاتا ہے...... اشاروں پر چلنے لگتا ہے تو پھر اسے نہیں مارا جاتا۔ ہم تو گھوڑوں سے محبت کرتے ہیں نکے شاہ۔ انہیں مارتے ہیں تو ہمارا دل دکھتا ہے۔ لیکن ان کی دوستی میں انہیں مارنا پڑتا ہے۔ گھوڑا بھی یہ بات سمجھتا ہے۔

آپ ابھی چھوٹے ہیں۔ کیسے سمجھاؤں آپ کو۔ گھوڑا بھی یہی چاہتا ہے۔ وہ ہر کسی کی اطاعت نہیں کرتا۔ صرف اسے آقا مانتا ہے، جو اس پر قابو کر سکتا ہو۔ گھوڑے پر اپنی طاقت، اپنا زور ثابت کرو، یہ ثابت کرو کہ تم اس کی اطاعت کی اہلیت رکھتے ہو، تب وہ رام ہوتا ہے۔ ہر گھوڑے پر کم از کم ایک بار یہ ثابت کرنا ہوتا ہے۔''

''چابک کے بغیر تربیت نہیں ہو سکتی انکل؟''

''نہیں نکے شاہ جی۔ چابک ضروری ہے۔ چاہے مارا نہ جائے۔ صرف آواز سنا دی جائے چابک کی۔ لیکن چابک کے بغیر سدھایا نہیں جا سکتا گھوڑے کو۔'' محمود خان کہتے کہتے رکا اور تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ ''دیکھو نکے شاہ جی۔ سختی کے بغیر تو انسان کا بچہ بھی انسان نہیں بنتا۔ اب آپ بچے ہو۔ آپ کو سب کچھ تو نہیں معلوم۔ آپ کو اچھا برا تو بتانا ہوگا۔ اور جو کام برا ہوتا ہے، وہ قدرتی طور پر اچھا بہت لگتا ہے۔ تو پھر اس سے روکنے کے لیے سختی تو کرنی پڑے گی نا۔ جتنی بری بات سے روکنا ہوگا، اتنی سختی کرنی ہوگی۔''

عمران کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا۔ ''میرے طوفان کو بھی چابک سے ماریں گے آپ؟''

''مارنا پڑے گا۔ ورنہ وہ آپ کا گھوڑا کیسے بنے گا۔''

''تو پھر میرے سامنے ہی سدھایئے گا اسے۔'' عمران نے کہا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ موسم بدلتا گیا۔ دن تھوڑا تھوڑا کر کے بڑھتا رہا۔ سردی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ بارش کی جھڑی لگ جاتی تو البتہ بہت ٹھنڈ ہو جاتی۔

ایک دن فون پر نعمان شاہ نے عمران سے پوچھا۔ ''بیٹے...... کوئی بات بھی سیکھی تم نے؟''

''جی ہاں پاپا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھنا سیکھ لیا ہے۔''

''تو بتاؤ، کیا وقت ہوا ہے ابھی۔''

''چھ بج کر بیس منٹ۔''

''واہ یار بیٹے۔ شاباش۔ اور کچھ۔''

''آج منگل ہے پاپا۔ کل بدھ ہوگا۔ آج فروری کی پانچ تاریخ ہے۔''

نعمان سچ مچ خوش ہو گیا۔ ''یہ کس نے سکھایا تمہیں؟''

''جمیلہ باجی نے۔ انہوں نے مجھے گھڑی دیکھنا سکھایا ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''اور پاپا...... میں یہ بھی سمجھ گیا ہوں کہ تربیت کے لیے چابک ضروری ہوتا ہے۔ چاہے صرف اس کی آواز ہو۔''

نعمان کو حیرت ہوئی۔

عمران بہت کچھ دیکھ، سمجھ اور سیکھ رہا تھا۔ اب وہ صحیح معنوں میں فطرت کی گود میں پل رہا تھا۔ فطرت اس کی پرورش کر رہی تھی۔ مثلاً ابتدا میں جب وہ درختوں کو دیکھتا تو ان کی سوکھی شاخوں کو دیکھ کر اسے یقین نہ آتا کہ یہ کبھی ہری ہو سکیں گی۔ وہ تو نری لکڑی ہو گئی تھی۔ ایک دن اس نے جمیلہ سے کہا۔ ''باجی

......آپ کو یقین ہے کہ ان درختوں پر پتے نکلیں گے؟"

"خود دیکھ لینا ننھے چاند۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"روزان سوکھی شاخوں کو دیکھا کرو۔"

پھر ایک دن ننھے عمران نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا، اس پر بھی اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے شاخ کو چھو کر دیکھا۔ شاخ میں نمی تھی۔ اب وہ نری سوکھی لکڑی نہیں تھی۔ اس میں تری آ گئی تھی اور ہلکا سا چپچپا پن بھی تھا۔ پہلی بار اسے یقین آیا کہ پتے نکلیں گے۔ اب وہ بہار کا راستہ تک رہا تھا۔

اس شام جمیلہ ایک پتھر پر بیٹھی عمران کو علی بابا کی کہانی سنا رہی تھی۔ سامنے بکریاں ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ جمیلہ کے پاس بچوں کی کہانیوں کی بہت ساری کتابیں تھیں۔ بیشتر کہانیاں اسے یاد تھیں۔ اس نے عمران سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ پوری طرح پڑھنے لگے گا تو وہ سب کتابیں اسے دے دے گی۔

کہانی سناتے سناتے جمیلہ اچانک چپ ہو گئی۔ وہ یوں ایک طرف چہرے کر کے ساکت ہوئی، جیسے کوئی دور کی آواز سننے کے لیے سماعت پر زور دے رہی ہو۔ "کیا ہو گیا؟ سنائیں نا باجی۔" عمران نے کہا۔ اسے بے تابی ہو رہی تھی۔ کہانی ہی ایسے موڑ پر تھی۔ چور دیگوں میں بند تھے۔

"بھول جاؤ کہانی کو ننھے چاند۔" جمیلہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔

"نہیں باجی۔ کہانی پوری کریں۔"

"کہانی تو اب پوری نہیں ہو گی۔ جاؤ ننھے شاہ جی۔ تمہارے پاپا آ رہے ہیں۔ تم نیچے جاؤ۔ تمہیں دیکھ کر وہ خوش ہو جائیں گے۔"

"کیا؟ پاپا آ رہے ہیں؟" عمران کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے گاڑی کی آواز سنی ہے۔ تم جاؤ نا۔"

عمران اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا کہ وہ اندھا دھند بھاگ کھڑا ہو گا۔ جمیلہ اداس ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا، اپنوں کی خوشی میں کون پرایوں کو یاد رکھتا ہے۔ مگر اسی لمحے عمران نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی اور اس بات کی غماز کہ خوشی میں اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔ "آپ بھی آئیں نا باجی۔"

"نہیں ننھے شاہ۔ تم جاؤ۔ میں اپنی بکریوں کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

جمیلہ کو اس پر پیار آ گیا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس وقت بچے کا دل چاہ رہا ہو گا کہ اڑ کر باپ کے

پاس پہنچ جائے۔ لیکن اس کی وجہ سے ضبط کر رہا تھا۔ "تم جاؤ ننھے۔ تمہارے پاپا خوش ہوں گے...... جاؤ...... تمہیں میری قسم۔"

عمران چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر پلٹا اور پگڈنڈی کی طرف دوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد جمیلہ پہاڑ کے کنارے پر گئی۔ جہاں سے کچی سڑک نظر آتی تھی۔ اس نے نیچے دیکھا۔ گاڑی کی آواز اب زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ مگر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ نظریں جمائے کھڑی رہی۔ بالآخر ایک موڑ سے جیپ مڑتی دکھائی دی۔

بہار سے پہلے بہار آ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

فروری کا آخری ہفتہ شروع ہوا تو نعمان شاہ کو ہول اٹھنے لگا۔ طویل چھٹیوں کے بعد یکم مارچ کو اسکول کھل رہا تھا۔ اتنے عرصے میں تو عمران راستہ بھول چکا ہو گا۔ معمولات اسے یاد نہیں رہے ہوں گے۔ صابر شاہ کو بھی شاید احتیاطی تدابیر یاد نہ رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے پر نظر رکھنے والا کوئی نہ ہو اور بچہ راستہ بھٹک جائے۔ وہ وسوسوں کا شکار ہوتا گیا۔ آخر ۲۶ فروری کو اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے اپنے منیجر کو بلا کر سمجھایا اور اپنے لیے اگلے روز کی فلائٹ میں سیٹ ریزرو کرا لی۔ راولپنڈی سے اس نے جیپ کرائے پر لی اور چل دیا۔ اس نے فون پر آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ بیٹے کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

لیکن گیراج کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ بیٹے نے اسے سرپرائز دی ہے۔ عمران اس کا منتظر تھا۔ اس نے کار سے اترتے ہی عمران کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اسے خوب پیار کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "بیٹے...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کا انتظار۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آ رہا ہوں۔"

"باجی نے کہا تھا کہ آپ آ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔"

نعمان کو حیرت ہوئی۔ لڑکی کو کیسے معلوم ہو گیا۔ مگر پھر وہ سمجھ گیا کہ اس نے گاڑی کی آواز سن لی ہو گی۔ پہاڑ پر رہنے والوں کی سماعت بے حد حساس ہوتی ہے۔ اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی، اپنا بیگ نکالا اور بیٹے کا ہاتھ تھام کر پگڈنڈی پر چل دیا۔

گھر میں صرف کلثوم تھی۔ اس کی آمد اس کے لیے ضرور سرپرائز تھی۔ رب نواز کچھ سامان لینے شہر گیا ہوا تھا۔ اور جمیلہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ جمیلہ نے ہی عمران کو نیچے بھیجا تھا اور خود غائب تھی۔ چند گھنٹوں میں ہی نعمان شاہ کو احساس ہو گیا کہ حیران کر دینے والی لڑکی اس بار اس سے کترا کر اسے حیران کر رہی ہے۔ عجیب اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ اس بات سے اس کے دل کو ٹھیس لگی تھی۔ رات ہو گئی۔ کھانا کھا لیا گیا۔ مگر جمیلہ ایک بار بھی اس کے سامنے نہیں آئی۔

اس رات بستر پر لیٹا وہ جمیلہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کراچی میں ان گنت تنہا راتوں میں اس نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا تھا...... شعوری طور پر نہیں، لاشعوری طور پر۔ شعوری طور پر تو وہ اس کے بارے میں سوچنے سے بچنا چاہتا تھا۔

نعمان شاہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ چالیس سال کا پختہ کار مرد تھا۔ اس نے ایک بھرپور زندگی گزاری تھی۔ اسے تو نظروں کی بھی پہچان تھی۔ جب کہ یہاں تو بات نظروں سے آگے کی تھی۔ اس لڑکی کا انداز...... اس کے تیور ہی بہت کچھ بتاتے تھے۔

پچھلی بار کے قیام میں اس نے جان لیا تھا کہ جمیلہ اس کی محبت میں مبتلا ہے۔ اسے وہ پہلی رات بھی یاد تھی، جب جمیلہ آدھی رات کو اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ کوئی چیز لینے نہیں آئی تھی۔ وہ اسے جگا کر اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی...... اور وہ بات سننے سے ڈرتا تھا۔ اسی لیے اس نے اس انداز میں مداخلت کی تھی اور اپنا لہجہ اتنا کڑا رکھا تھا کہ لڑکی گڑبڑا گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آتش دان میں لکڑیاں ڈالنے آئی تھی۔ حالانکہ دس منٹ سے زیادہ کمرے میں موجود رہنے کے باوجود اس نے آتش دان میں لکڑیاں نہیں ڈالی تھیں۔

پھر اس نے جس انداز میں اس سے پوچھا تھا کہ اس نے شہری لڑکی سے شادی کیوں کی تو وہی اسے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ اور اس نے جب یہ کہا کہ پڑھی لکھی بیوی بچوں کی تعلیم کا خیال رکھ سکتی ہے...... ان کی اچھی تربیت کر سکتی ہے تو وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کہتے کہتے رک گئی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں درگزر کا عکس نظر آیا تھا، جیسے وہ جو کچھ کہہ سکتی ہے، کہہ کر اسے زخمی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر نعمان شاہ نے وہ ان کہی بات سمجھ لی تھی اور بات ٹھیک بھی تھی۔ وہ اپنے بچے کو تعلیم و تربیت کے لیے ان لوگوں کے پاس لے کر آیا تھا، جو تعلیم سے محروم تھے۔ نعمان شاہ حیران ہوا تھا کہ کم عمر لڑکی نے یہ بات کیسے سمجھ لی کہ اس کی تعلیم یافتہ شہری بیوی اس کے لیے ایک مکمل بیوی نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ اس زمین پر ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی تھی، جس سے اسے عشق تھا۔ وہ اونچی عمارتوں کے درمیان، گھٹی ہوئی فضا میں، آلودہ ہوا میں اور ٹریفک کے شوروغل میں خوش رہتی تھی اور گاؤں کی کھلی فضا اسے ڈراؤنی اور صاف ستھری نتھری ہوئی ہوا بیمار کر دینے والی لگتی تھی۔ اور گاؤں کا سکون اسے مرگھٹ کا سناٹا لگتا تھا۔ دوسری طرف نعمان شاہ ایک ایسا شخص تھا، جو اپنی مٹی سے ناتا کبھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ لہٰذا اسے ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ اسے ادھوری بیوی اور ادھوری ازدواجی زندگی ملی ہے۔ پھر جمیلہ نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی ایک بات کہہ دی تھی۔ ایسی عورت بھی ہو سکتی ہے، جو پڑھی لکھی نہ ہو۔ پھر بھی بچوں کی تعلیم کا خیال رکھ سکے۔ ان کی اچھی تربیت کر سکے۔ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ ایسا تھا، جیسے وہ خود کو اس آزمائش کے لیے پیش کر رہی ہو۔

پھر جمیلہ نے سکول سے آتے ہی عمران کی کاپیاں چیک کی تھیں اور اسے ہوم ورک کرایا تھا۔ جب کہ وہ خود یہ بات بھول گیا تھا۔ اور جب اس نے ممنونیت سے اسے دیکھا تو جمیلہ نے کتنی سادگی سے

اسے جتایا تھا۔ اس نے کہا تھا...... میرے سرکار، میں پڑھی لکھی تو نہیں ہوں۔ لیکن اتنا خیال تو رکھ سکتی ہوں۔

پھر جب وہ اسے باغ دکھانے لے گئی تھی تو اس کی شکایت کہ وہ اتنے عرصے بعد آیا ہے کہ ننھے پودے درخت بن گئے۔ اور پھل بھی دینے لگے۔ پھر جمیلہ کا یہ کہنا کہ سیزن میں یہ سب درخت آپ کا انتظار کریں گے۔ اس باغ سے پہلا پھل آپ کو ہی توڑنا ہے۔ تو اس وقت گویا وہ کہہ رہی تھی کہ وہ سیزن پر اس کا انتظار کرے گی اور باغ سے پہلا پھل اس کے سوا کسی کو نہیں توڑنے دے گی۔ یعنی اس نے یہ باغ اس کے لیے لگایا ہے۔

کراچی میں تنہا راتوں میں نعمان شاہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی غیر شعوری طور پر یہ ساری باتیں کئی بار یاد کی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پاگل اور حیران کن لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کا عملیت پسند ذہن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ پاگل پن ہے۔ یہ بننے والی بات نہیں۔ کسی بھی زاویے سے ممکن نہیں۔

ایک زاویہ تو یہ تھا کہ جمیلہ بہت کم عمر تھی اتنی کم عمر کہ اس بار سے پچھلی بار جب اس نے اسے دیکھا تھا تو وہ گیارہ بارہ سال کی بچی تھی...... غیر اہم بچی، جسے کوئی دوبارہ نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ اب وہ اتنی حسین تھی کہ اس پر نظر پڑے تو جم کر رہ جائے اور قدم زمین میں گڑ جائیں اور انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔ اس کے باوجود وہ تھی تو کم عمر ہی۔ وہ کتنا ہی بڑا بننے کی کوشش کر لے، کتنی ہی بڑائی خود پر لاد لے مگر چھوٹی ہی رہے گی۔ وہ اتنی کم عمر تھی کہ اگر نعمان نے علاقے کے رواج کے مطابق کم عمری میں شادی کر لی ہوتی تو جمیلہ سے بڑی اس کی بیٹی ہوتی۔

پھر ایک بہت بڑا فرق مرتبے اور مقام کا تھا۔ نعمان شاہ کا تعلق ایک معزز سادات گھرانے سے تھا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا اور روشن خیال بھی۔ انسان کی برتری کی بنیاد اس کے اوصاف کو سمجھتا تھا۔ نسلی برتری کا وہ قائل نہیں تھا۔ صرف سید ہونے کی بنیاد پر لائق پرستش ہونے کا تصور اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ مگر یہاں کی زمین میں اس کی جڑیں تھیں، اس کے آباؤاجداد کی قبریں تھیں۔ اس مٹی سے اسے عشق تھا۔ اسے وہ چھوڑ سکتا ہوتا تو کراچی جیسے شہر سے بار بار یہاں کیوں آتا۔ اپنے بیٹے کو تعلیم و تربیت کے لیے یہاں کیوں لاتا۔ اور وہ جانتا تھا کہ یہ علاقہ روایات میں جکڑا ہوا ہے۔ جو یہاں رہے گا، وہ ان روایات کا احترام بھی کرے گا۔ تبھی اس کا احترام ہوگا۔ یہاں روایت تھی کہ خوش حالی ہو تو ۷۰ سال کا بڈھا بھی ۱۴ سال کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ یہاں روایت تھی کہ کوئی سید کسی غیر سید سے شادی نہیں کرتا تھا۔ خود غیر سید لوگ اسے سادات کی توہین خیال کرتے تھے۔

مگر کم عمر جمیلہ کو ان روایات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لڑکپن کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے...... پہاڑی نالے کی طرح منہ زور، پرشور اور ہنگامہ خیز اور پہاڑی نالے ہی کی طرح ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے، جسے سوکھنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ لہٰذا نعمان اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

مگر اب جمیلہ اس سے کترا رہی تھی تو اس کے دل کو ٹھیس کیوں لگی تھی؟ وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار تھا کہ اس نوعمر لڑکی نے اسے متاثر کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان پہاڑوں میں ایسی غیر معمولی لڑکی کی موجودگی کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ عقل مند تھی۔ اس کی سوجھ بوجھ غیر معمولی تھی۔ اس میں خوش سلیقگی شہر والوں کی سی تھی۔ اسے اپنی بات موثر انداز میں کہنے کا ہنر بھی آتا تھا، ایسے کہ مخاطب کو بھی برا نہ لگے اور وہ اس کی گرفت بھی نہ کر سکے۔ یہ بات طے تھی کہ وہ جس گھر میں بھی جائے گی، اسے روشن کر دے گی۔ وہ شخص خوش نصیب ہوگا، جس کی وہ بیوی بنے گی۔ لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ اس کے لیے نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔

تو پھر اس کے کترانے سے اس کے دل کو ٹھیس کیوں لگ رہی ہے۔ وہ تھکن کے باوجود، نیند آنے کے باوجود کیوں نہیں سو رہا ہے۔ وہ آج شعوری طور پر کیوں سوچ رہا ہے۔ اس کے اشاروں کنایوں کو یادداشت میں کیوں کرید رہا ہے۔ کیا یہ......؟ نہیں...... یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ بھی غیر محسوس طور پر اس کی محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا ہے۔ اول تو اس کی عمر ہی نہیں محبت کرنے کی۔ یہ تو نوخیز لڑکوں کی سی حرکت ہوئی۔ اور وہ ایک باوقار مرد ہے، جس کی عزت کی جاتی ہے...... ہر جگہ احترام ہے جس کا، اسے روایات کا، اپنی عزت و احترام کا اور اپنے آباؤ اجداد کی عزت کا خیال رکھنا ہے۔

اس نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا۔ لیکن اس معاملے میں خود کو بے حد غیر لچک دار پایا۔ اسے اطمینان ہو گیا۔ اندر خواہ کچھ بھی ہوتا رہے۔ مگر اس سے ایسی کوئی غلطی کبھی سرزد نہیں ہوگی۔ مضبوطی کے اس احساس کے ساتھ وہ سو گیا۔

☆☆☆☆☆

صبح وہ دیر سے اٹھا۔ کلثوم نے اسے ناشتا کرایا۔ عمران گھر میں نہیں تھا۔ جمیلہ بھی نہیں تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ سردی تھی مگر ستانے والی نہیں۔ اس نے بغیر آستینوں والا سویٹر پہنا اور باہر نکل آیا۔ شام کو وہ عمران میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ گندم کے بوٹے کتنے بڑے ہو گئے۔ اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی شہری زندگی اپنی جگہ، مگر فصل دیکھ کر وہ کسانوں کی طرح خوش ہوتا تھا۔ اس خوشی کا نہ کوئی بدل تھا، نہ اس کی مثال دی جا سکتی تھی۔

کھیت کی حدود سے نکلا تو اسے جمیلہ اور عمران نظر آئے۔ وہ بلا ارادہ ان کی طرف چل دیا۔ جمیلہ نے مودبانہ انداز میں اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''کیسی ہو جمیلہ؟''

''ٹھیک ہوں شاہ جی۔''

اچانک نعمان کے اندر کوئی نوخیز لڑکا انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور ادھیڑ عمر اور باوقار نعمان شاہ پر پوری طرح چھا گیا۔ ''جمیلہ...... ہم سے ناراض ہو گیا۔ کل سے صورت ہی نظر نہیں آئی تمہاری۔ کوئی مزے کا کھانا بھی نہیں کھلایا تم نے۔''

جمیلہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت تھی۔ پھر مسرت اور امید کے رنگ لہرائے۔ ''آپ جانتے ہیں سرکار کہ ہمارے ہاں غلاموں کے آقا سے ناراض ہونے کا رواج نہیں۔ پھر بھلا میں آپ سے کیوں ناراض ہوتی۔ ایسی کوئی بات ہی نہیں۔''

مگر یہ وہ لمحہ تھا کہ نعمان شاہ خود سے بری طرح چڑ چکا تھا۔ اسے اپنے اندر سر اٹھانے والے سرکش لڑکے پر اس زور کا غصہ آیا تھا کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اس نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی اجنبیت اور بے رخی سموتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ تو ہے۔ ناراض ہونے کا حق تو صرف آقا کو ہوتا ہے۔ غلام ناراض نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی ہو جائے تو مجھے کیا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طرف تو خود سے اس بے خودی کا انتقام لیا تھا۔ کیونکہ یہ غرور اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ غرور کے معاملے میں وہ خدا سے بہت ڈرتا تھا۔ اسی لیے اسے انکسار اچھا لگتا تھا۔ دوسری طرف اس نے جمیلہ کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ جو بات جمیلہ نے شکایتاً کہی تھی، اس نے جتایا تھا کہ وہ اسے حقیقت سمجھتا ہے۔ اس نے جمیلہ کو اس کی اوقات یاد دلائی تھی تاکہ وہ آئندہ ایسے ویسے خواب نہ دیکھے۔ اس نے جمیلہ کی اس خودداری کو اکسایا تھا، جو اس کے ہر انداز میں نظر آتی تھی۔

لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ جمیلہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری، جیسے اس نے اس کے دل کا حال جان لیا ہو۔ سمجھ لیا ہو کہ یہ اس کمزوری کا ردعمل ہے، جس کا مظاہرہ آقا نے پہلی بار کیا تھا۔ وہ مسکراتی رہی۔ لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

اسی لمحے ننھے عمران نے دھماکا کر دیا۔ ''پاپا...... یہ تو آپ سے محبت کرتی ہیں۔ جب آپ گئے تھے تو یہ مجھ سے بھی زیادہ روئی تھیں۔''

جمیلہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ متوقع نظروں سے نعمان شاہ کو دیکھتی رہی۔ لیکن اب نعمان شاہ نے اپنی پوری ذہنی قوت سے خود پر قابو رکھا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے جمیلہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اچھے بچے وہی ہوتے ہیں جو اپنے بزرگوں سے محبت کریں۔''

اس بار اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ جمیلہ یوں تمتمائی جیسے اس کے جسم پر کوئی کوڑا لگا ہو۔ اس کے چہرے پر اذیت کا تاثر تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے بھاگتی ہوئی گھر کی طرف چلی گئی۔ نعمان شاہ نے طمانیت سے سر ہلایا۔ پہلا نہ سہی، دوسرا وار کاری ثابت ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب لڑکی کے دل سے محبت کا خناس نکل جائے گا۔ ادھر عمران کی بات نے اس کے انداز کی پوری طرح تصدیق کر دی تھی اور جمیلہ کا آخری ردعمل اس کا ثبوت تھا۔ یعنی اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

مگر دوپہر کا کھانا منہ سے بول رہا تھا کہ اسے جمیلہ نے پکایا ہے البتہ جمیلہ اس کے سامنے نہیں آئی۔ رات کا کھانا بھی بہت اچھا تھا۔ کھانے کے بعد نعمان نے بیٹے سے کہا۔ ''عمران...... کل تمہارا اسکول کھل رہا ہے۔''

"جی پاپا...... مجھے یاد ہے۔"

"ہوم ورک مکمل ہے بیٹے؟"

"جی پاپا۔ لا کر دکھاؤں؟" عمران نے پوچھا۔ نعمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عمران اپنا بیگ اٹھا لایا۔ پہلے اس نے سکول کا ہوم ورک دکھایا۔ کام ہر اعتبار سے مکمل تھا۔ پھر عمران نے گھر کی کاپیاں دکھائیں۔ "یہ باجی مجھ سے کراتی رہی ہیں۔"

نعمان کو خوشی ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب تک عمران اپنی کلاس کے نمایاں ترین بچوں میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ دیکھ کر بھی اسے خوشی ہوئی کہ جمیلہ کی ہینڈ رائٹنگ بہت پیاری ہے۔ "جاؤ بیٹے...... اب سو جاؤ۔ اسکول جانے کے بارے میں بھی سب یاد ہے؟"

"جی ہاں پاپا۔"

☆☆☆☆☆

اگلی صبح جمیلہ نے عمران کو سکول کے لیے تیار کرایا۔ نعمان بیٹے کو ساتھ لے کر نکلا۔ اس نے عمران کو آگے رکھا تھا۔ یہ بات خوش آئند تھی کہ عمران کو راستہ پوری طرح یاد تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کبھی کبھی جمیلہ کے ساتھ اس راستے پر آیا کرتا تھا۔

ڈھلان پر پہنچ کر انہوں نے نیچے دیکھا۔ گاڑی موجود تھی۔ "جاؤ بیٹے...... خدا حافظ۔" اس نے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

عمران نے اس سے پوچھا بھی نہیں کہ وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں چل رہا ہے۔ اس نے سلام کیا اور بڑے اعتماد سے ڈھلوان سے اترنے لگا۔ یہ اعتماد ان دو مہینوں کی وجہ سے تھا، جو اس نے ان پہاڑوں کے درمیان گھوم پھر کر گزارے تھے۔ نعمان کھڑا دیکھتا رہا۔ عمران نیچے پہنچ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چلنے سے پہلے اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر لہرایا تھا۔ نعمان بھی ہاتھ ہلاتا رہا۔

واپس آتے ہوئے گھر سے کچھ پیچھے اسے جمیلہ نظر آئی۔ وہ باغ کی طرف سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ نعمان کو آتے دیکھا تو وہ اس کی طرف لپکی۔ "شاہ سرکار...... میرے ساتھ آئیں۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟ کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے۔"

"آپ آئیں تو۔" جمیلہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کھینچنے لگی۔

نعمان نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ دراصل اسے تشویش ہو رہی تھی کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ ممکن ہے، کوئی سانپ نظر آیا ہو جمیلہ کو۔

جمیلہ اسے درختوں کے جھنڈ میں لے گئی۔ "بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟" نعمان نے پوچھا۔

"بتانے کی نہیں، دکھانے کی چیز ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ وہ اسے ایک درخت کے نیچے لے گئی۔ "وہ دیکھیں...... وہاں......" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

نعمان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پہلے تو اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ "کیا ہے؟"

"وہ...... وہ اوپر دیکھیں نا۔"

اس بار نعمان کو وہ چھوٹا سا، خوبصورت سا سفید پھول نظر آ گیا۔ نکھرا ہوا تر و تازہ پھول، جو ٹہنی سے جھول رہا تھا۔ وہ آلوچے کا درخت تھا۔ "حیرت ہے!" وہ بڑبڑایا۔

"جی شاہ جی سرکار۔ بہار سے پہلے پھول کھلا ہے یہ۔ اور میں نے ہر درخت کو دیکھا ہے بس یہی ایک پھول ہے۔"

حسن پسند اور فطرت پرست نعمان کو یوں لگا، جیسے وہ پھول اس کے دل میں کھلا ہے۔ ایک عجیب سی سرشاری تھی، جو اس پر طاری ہو گئی۔ موسم بہار کے پہلے پھول کی دید بے اندازہ خوشی دیتی ہے۔ جب کہ یہ تو بہار سے پہلے بہار کی آمد کا نقیب پھول تھا۔ وہ سحر زدہ سا اسے دیکھتا رہا۔ خزاں رسیدہ درخت، جس پر ایک پتا بھی نہیں تھا، اس پھول کو تمغے کی طرح اٹھائے کھڑا تھا، اس سپاہی کی طرح جو جنگ میں اپنا سب کچھ لٹا کر فتح یاب لوٹا ہو۔

اس نے تصور میں دیکھا کہ آلوچے کا وہ درخت سفید پھولوں سے لد گیا۔ پتے نکل رہے ہیں۔ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ بہار ہے۔ موسم بھی انسان پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ خزاں رسیدہ درخت جب لٹا پٹا کھڑا ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اب یہ کبھی ہرا نہیں ہو گا۔ رات کو اس درخت کو دیکھ کر سوؤ اور صبح دیکھو کہ بہار آ گئی ہے۔ ایک رات کی بارش نے اسے ہرا ابھرا کر دیا ہے۔ کیسی ہی مایوس کن صورت حال ہو، اسے دیکھ کر آدمی کے دل میں بہت روشن امید جاگ اٹھتی ہے۔ ایسی طاقت محسوس ہوتی ہے کہ لگتا ہے، پہاڑ بھی اٹھا کر کہیں کا کہیں رکھ سکتے ہیں۔

اس لمحے نعمان کو بہت کچھ یاد آ گیا، جو یادداشت میں کہیں دب گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ یہاں رہتا تھا تو اس نے موسم کے سب رنگ دیکھے تھے۔ سردی کے دو رنگ تھے۔ نیچے مٹی کا بھورا رنگ اور اوپر برف۔ گرمی کا رنگ غضب ناک نارنجی تھا۔ بہار دھنک کی طرح تھی...... رنگ ہی رنگ۔ خزاں کا رنگ زرد تھا، ساون کا سبز اور بھادوں کا خوبصورت دھانی رنگ۔ لیکن بیس سال، کراچی میں رہ کر وہ یہ سب بھول گیا تھا۔ وہاں نہ کوئی رنگ تھا، نہ موسم، مایوسی طاری ہو جائے تو دور نہیں ہوتی تھی۔ دل میں خود بخود امید نہیں پھوٹتی تھی۔ ہر دن ایک جیسا لگتا تھا اور یکسانیت کا احساس بے زار کر دیتا تھا۔ قدرت نے موسموں کے ذریعے انسان کو تنوع کی رنگا رنگی کی جو نعمت عطا کی تھی، وہ شہر اس سے محروم تھا۔

نعمان نے سوچا، میں بھی ایک درخت کی طرح موسم خزاں میں ہوں۔ میں جلایا سوکھا نہیں...... مجھ پر بھی بہار آئے گی......

جمیلہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''شاہ جی سرکار، پہلا پھول تو آپ نے بہار سے پہلے ہی دیکھ لیا۔ اب پہلا پھل بھی خود ہی آ کر توڑیئے گا۔''

اس مداخلت نے وہ طلسم توڑ دیا۔ نعمان شاہ جو اس وقت خود کو برگ و بار سے لدے ایک ہرے بھرے درخت کے روپ میں دیکھ رہا تھا، ایک ثانیئے میں ٹنڈ منڈ درخت کی طرح ہو گیا۔ اس بار اس نے اپنے اندر کے نوعمر لڑکے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ کون ہے...... نعمان شاہ! سید نعمان حسین شاہ۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''دیکھا جائے گا۔''

''میں اس باغ سے کسی کو پھل توڑنے نہیں دوں گی۔'' جمیلہ نے ہٹیلے پن سے کہا۔ اس وقت وہ سرکشی پر آمادہ تھی۔

''پھل کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ پک جائیں تو ٹوٹ کر گر جاتے ہیں۔''

''میں زمین سے بھی کسی کو نہیں اٹھانے دوں گی۔'' وہ بولی۔ ''پھر آپ اس باغ کو نہیں، پھلوں کے قبرستان کو دیکھیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

نعمان شاہ وہیں کھڑا بہار و خزاں کے فلسفے پر غور کرتا رہا۔ بہار اور خزاں دونوں زندگی ہیں...... زندگی کی طرح عارضی اور ناپائیدار۔ اور درخت کا جلنا سوکھنا موت ہے۔ وہ بھی عارضی۔ پھر وہ زندگی ہے، جسے موت نہیں۔ وہ بہار ہے، جسے خزاں کا ڈر نہیں۔ یہی کچھ سوچتا ہوا وہ نیچے اتر آیا۔

☆☆☆☆☆

تین دن گزارنے کے بعد نعمان شاہ مطمئن واپس چلا گیا۔

سید عمران حسین شاہ کی زندگی پہلے کی طرح بہتی رہی۔ بس اس میں اسکول کی گزرگاہ کا اضافہ ہو گیا۔

ایک دن جمیلہ عمران کو ہوم ورک کرانے بیٹھی تو اسے احساس ہوا کہ وہ بہت چپ چپ ہے۔ ''کیا بات ہے ننھے شاہ جی؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں باجی۔''

''کچھ تو ہے۔ پاپا یاد آ رہے ہیں؟''

''نہیں باجی۔ کچھ بھی بات نہیں۔''

جمیلہ نے اسے پیار کیا۔ ''تمہیں میری قسم۔ مجھے بتا دو نا۔''

عمران چند لمحے ہچکچاتا رہا پھر بولا۔ ''باجی...... کلاس میں سب بچے اپنی امّی کی بات کرتے ہیں۔''

جمیلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ نعمان شاہ بچے کو جس محرومی کے احساس سے بچانے کے لیے لایا تھا، اس کی توقع کے عین مطابق وہ محرومی اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آ گئی تھی۔ جمیلہ افسردہ ہو کر سوچتی رہی۔ محرومی...... کسی نہ کسی طرح کی محرومی تو ہر انسان کا مقدر ہے۔ یہ تو فطری چیز ہے۔ اس سے

کسی کو نہیں بچایا جا سکتا۔ پھر محرومی کو قبول کرنے کی فطرت بھی تو خدا نے انسان کو دی ہے۔ اس لمحے اسے نعمان سے اختلاف ہوا۔ وہ باپ بن کر سوچتا تھا، انسان بن نہیں۔ خیر...... اسے کیا۔ اُس کے سرکار کا حکم ہے تو اسے بچے کو اس محرومی سے بچانے کی ہر وہ کوشش کرنی ہے، جو وہ کر سکتی ہے۔ مگر یہ حکم کیسے تھا سرکار کا؟ کب یہ حکم دیا سرکار نے؟ دماغ نے پوچھا۔ جب انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ بچے کو اس محرومی سے بچانا چاہتے ہیں اور ہمیں تاکید کی کہ ہم اس کے سامنے اس کی مرحوم ماں کا تذکرہ نہ کریں اسکا مطلب یہی تھا کہ بچے کو اس محرومی کے احساس سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی ہے۔

''تو پھر؟'' اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟'' اس نے عمران سے پوچھا۔

''میری امی جو نہیں ہیں۔''

''اچھا...... یہ بتاؤ کہ بچے تمہیں کیا بتاتے ہیں۔ ان کی امی کیسی ہیں...... کیا کرتی ہیں؟''

''سب کی امی بہت پیاری ہیں۔ پیار سے بچوں کا منہ دھلاتی ہیں، نہلاتی ہیں، کپڑے بدلاتی ہیں، پیار کرتی ہیں۔ بچوں کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ انہیں کھانا کھلاتی ہیں۔ اپنے ساتھ لپٹا کر سلاتی ہیں''

''ایک بات بتاؤ ننھے۔ میں پیاری نہیں ہوں کیا؟'' جمیلہ نے پوچھا۔

عمران نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ''آپ تو بہت پیاری ہیں۔ اتنی پیاری تو کسی کی بھی امی نہیں ہوگی۔''

''میں تمہارا منہ پیار سے نہیں دھلاتی؟ میں تمہیں نہلاتی؟ کپڑے نہیں بدلاتی تمہارے؟''

''باجی...... میں نے یہ تو نہیں کہا......'' عمران نے احتجاج کیا۔

لیکن جمیلہ نے سوالات جاری رکھے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلتی؟''

''کھیلتی ہیں۔''

''کیا میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا نہیں کھلاتی؟''

''کھلاتی ہیں۔''

''اور کیا میں تمہیں اپنے سینے سے لگا کر نہیں سلاتی؟''

''سلاتی ہیں۔'' عمران اب اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا

''تو پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ تمہاری امی نہیں ہیں۔''

''مگر باجی، آپ میری امی تو نہیں۔ آپ تو باجی ہیں۔'' عمران نے معصومیت سے کہا۔

جمیلہ کا چہرہ تپنے لگا۔ گفتگو اب نازک مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ ''میں تمہاری باجی نہیں ہوں۔ تمہاری باجی بننا نہیں چاہتی ہوں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر آپ میری امی تو نہیں ہیں۔''

''کیوں نہیں ہوں۔'' جمیلہ کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ دل کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ لگتا تھا، تیز دھڑکتے

دھڑکتے کتے تھک کر رک جائے گا۔ ''میں تمہاری امی ہی تو ہوں۔'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ کوئی بات سوچنا کتنا آسان ہے اور کہنا کتنا مشکل۔

عمران نے اسے یوں دیکھا...... سر سے پاؤں تک جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ وہ بہت خوشی سے مسکرایا۔ مگر فوراً ہی بجھ گیا۔

جمیلہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ سمجھ گئی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ''تم مجھے امی ہی کہا کرو۔ میں ہوں ہی تمہاری امی۔ تم اپنی کلاس کے بچوں کو میرے متعلق بتایا کرو۔ مجھے یقین ہے، کسی کی امی بھی وہ سب کچھ نہیں کر سکتی جو میں کر سکتی ہوں۔ تمہاری امی جیسی کسی کی امی نہیں ہوگی۔ بتاؤ کسی بچے کو اس کی امی نے درختوں پر چڑھنا سکھایا ہے۔ میں تمہیں درختوں پر چڑھنا سکھاؤں گی۔ میں تمہیں خرگوش کا شکار کرنا سکھاؤں گی۔ میں تمہیں ایسے ایسے کھیل سکھاؤں گی، جو تمہاری اسکول کے کسی بچے کو بھی نہیں آتے ہوں گے۔''

عمران کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے امی۔''

جمیلہ کا دل یوں دھڑکا، جیسے یہ جادوئی لفظ امی پہاڑوں پر ہونے والا بجلی کا کڑاکا ہو، جس سے پہاڑی زمین کے سینے میں رکے ہوئے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں عمران کے منہ سے امی سنتے ہی جیسے اس کے سینے میں بند مامتا کا کوئی کنوارا چشمہ پھوٹ بہا ہو۔ جیسے وہ سچ مچ ماں بن گئی ہو۔ اس نے عمران کو سینے سے بھینچ لیا۔ ''میرے ننھے سرکار......''

''آپ میری امی ہیں تو میرا نام کیوں نہیں لیتیں؟'' عمران نے اس کی آغوش میں کسمساتے ہوئے کہا۔

''اب تمہارا نام لوں گی لیکن وعدہ کرو، میری ایک بات مانو گے۔''

''مانوں گا امی...... پکا وعدہ۔''

''تم صرف اکیلے میں مجھے امی کہا کرو۔ سب کے سامنے نہیں۔ ہاں...... اسکول میں تم میری باتیں چاہے جس طرح کرو۔''

عمران کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ ''کیوں امی؟''

''سب کے سامنے کہو گے تو یہ لوگ تمہاری امی کو تم سے چھین لیں گے۔ وعدہ کرو بیٹے۔''

''ٹھیک ہے امی۔'' عمران نے کہا۔ ''لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ ہمیشہ میری امی رہیں گی۔''

''یہ میرا وعدہ ہے...... پکا وعدہ۔''

اس دن کے بعد وہ ایک جان دو قالب ہو گئے اور ان کی قربت بڑھتی ہی گئی۔

☆☆☆☆☆

اسکول شروع ہونے کے بعد گھوڑوں کے فارم والا معمول بدل گیا تھا۔ اب عمران چار بجے فارم جاتا تھا۔ جب سے اس نے جمیلہ کو امی کہنا شروع کیا تھا، اس میں ایک نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اسکول میں یہ تبدیلی اور نمایاں تھی۔ اس کا شرمیلا پن تقریباً ختم ہو گیا تھا اور خود اعتمادی بڑھ گئی تھی۔

عمران کو درختوں کے بارے میں بہت تجسس تھا۔ صبح اٹھتے ہی وہ گھر کے احاطے میں لگے ہوئے درختوں کو دیکھتا تھا۔ شام کو بھی وہ درختوں کو پر امید نظروں سے تکتا تھا۔ جمیلہ نے اسے بتایا تھا کہ بہار کے آنے کا ایک وقت مقرر ہے۔ کبھی کبھی اس میں دو چار دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ مگر پھر بھی جاننے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ بہار کو کب آنا ہے۔ اس کے باوجود بہار اس قدر اچانک اور اتنے چپکے سے آتی ہے کہ جاننے والوں کو بھی حیرت ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کی خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ جمیلہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ بہار ہمیشہ صبح کی پہلی خوشی بن کر آتی ہے۔

''بہار آنے کی تاریخ کیا ہوتی ہے؟'' ایک شام عمران نے پوچھا۔

''۲۱ مارچ، لیکن میں نے تمہیں بتایا نا کہ کبھی کبھی دو چار دن آگے پیچھے ہو جاتے ہیں۔''

عمران کے لیے جمیلہ سے کیا ہوا وعدہ نبھانا خاصا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ امی کہنا اسے اتنا اچھا لگتا تھا کہ وہ اسے کچھ اور کہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے لفظ امی زبان پر چڑھ گیا تھا۔ یہ احتیاط بہت مشکل تھی کہ سب کے سامنے اسے باجی کہا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اسے باجی کہنا بھی چھوڑ دیا۔

اُس رات گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ستارے بھی نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بارش بہت تیز نہیں تھی لیکن مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹے، تب بھی بارش ہو رہی تھی۔ صبح اٹھے، تب بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس علاقے میں بارش بہت ہوتی تھی۔ نعمان یہ بات جانتا تھا۔ اس لیے اس نے اس موسم کے لیے متبادل بندوبست کر دیا تھا۔ اس موسم میں ڈرائیور کو ہدایت تھی کہ وہ گاڑی اوپر گیراج تک لائے گا۔ گاڑی میں چھتری بھی موجود تھی۔

عمران معمول کے مطابق سات بجے تیار ہو گیا۔ بارش نہیں رکی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ڈرائیور چھتری لے کر خود اسے لینے آئے گا۔ وہ برآمدے میں آیا اور بارش کو دیکھنے لگا۔

کلثوم اور رب نواز اپنے کمرے میں تھے۔ رب نواز کے حقہ گڑگڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جمیلہ برآمدے میں آئی تو عمران نے کہا ''امی...... میں بارش میں نہانا چاہتا ہوں۔ مجھے بھیگنا اچھا لگتا ہے۔''

''یہ موسم بارش میں بھیگنے کا نہیں۔'' جمیلہ نے اسے سمجھایا۔

''بھیگنے والے موسم میں میں خود تمہیں کہوں گی کہ جا کر بارش میں نہاؤ۔''

''لیکن امی......''

''اس موسم میں بھیگو گے تو بیمار ہو جاؤ گے بیٹے۔''

اسی لمحے عمران کی نظر اٹھی اور جم کر رہ گئی۔ ایک خوش گوار حیرت اور بے پایاں مسرت نے اس کے وجود کو بھر دیا۔ سامنے لگا آلوچے کا درخت یوں سفید ہو رہا تھا، جیسے اس پر برف باری ہوئی ہو۔ درخت پر پھول ہی پھول کھلے تھے۔ سفید پھول۔ ہر شاخ پھولوں سے لدی تھی۔

''امی...... وہ دیکھیں......'' اس نے بے ساختہ کہا۔

جمیلہ نے اشارے کی سمت دیکھا اور خوش ہو کر چلائی۔ ''بہار آ گئی ہے۔''

تو یہ ہوتی ہے بہار۔ ننھے عمران نے سوچا۔ اتنی خوبصورت! یہ وہی درخت ہے لیکن صرف پھولوں کی وجہ سے درخت ہی نہیں، سب کچھ بدل کر رہ گیا ہے۔ پھر اس کی نظر خوبانی کے درخت پر گئی۔ وہ ہلکے سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں سے لدا تھا۔

''امی...... میں آج چھٹی نہیں کر سکتا؟'' عمران کے لہجے میں التجا تھی۔

''نہیں بیٹے۔ اسکول تو جانا ہے۔ تمہارے پاپا نے کہا تھا کہ تم اسکول سے چھٹی نہیں کرو گے۔''

اسی وقت کلثوم کمرے سے برآمدے میں نکل آئی۔ عمران کچھ کہنے والا تھا، مگر اسے دیکھ کر رک گیا۔ پھر اس نے بہت محتاط انداز میں کہا۔ ''آج بہار آئی ہے۔ میں اسکول نہیں جانا چاہتا۔''

''تو کیا حرج ہے۔'' کلثوم نے مداخلت کی۔ ''دیکھو...... بارش بھی ہو رہی ہے۔ ایک دن کی چھٹی میں کیا جاتا ہے۔''

''ماں...... یہ شاہ جی سرکار کا حکم ہے۔''

کلثوم خاموش ہو گئی۔ جمیلہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے عمران سے کہا۔ ''ایک صورت ہے، تم فون پر سرکار سے اجازت لے لو چھٹی کی۔''

عمران خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے...... چلیں۔''

ٹیلی فون جمیلہ کے کمرے میں تھا۔ نعمان نے گھر کا فون نمبر بھی لکھ دیا تھا اور دفتر کا بھی۔ اس وقت اسے گھر پر ہی ہونا تھا۔ جمیلہ نے عمران سے ہی نمبر ملوایا اور پھر متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ مگر عمران خاموش تھا۔ ''کیا بات ہے عمران؟'' جمیلہ نے پوچھا۔

''گھنٹی بج رہی ہے بس۔'' عمران نے بتایا۔

''تمہارے پاپا شاید سو رہے ہوں گے۔''

اسی لمحے دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ ''السلام علیکم پاپا۔''

''عمران...... کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے بیٹے؟''

''جی پاپا...... سب ٹھیک ہے۔ یہاں بہار آ گئی ہے۔''

''بہار آ گئی ہے؟ نعمان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو بیٹے۔'' اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ دن بھی ہر دن جیسا ہی لگ رہا تھا۔

''سچ پاپا...... بہار آ گئی ہے۔ پاپا...... مجھے اجازت دے دیں اسکول سے چھٹی کی۔ میں آج اسکول نہیں جانا چاہتا۔'' عمران کی آواز خوشی اور ہیجان سے لرز رہی تھی۔ لہجے میں التجا تھی۔ ''اور پاپا...... بارش بھی ہو رہی ہے۔''

نعمان کو بیٹے پر شدت سے پیار آیا۔ ''ٹھیک ہے بیٹے۔ آج نہ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''اس وقت تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''ام......'' عمران کہتے کہتے رک گیا۔ ''باجی ہیں۔''

''فون انہیں دے دو۔'' نعمان نے کہا۔

عمران نے ریسیور جمیلہ کو دے دیا۔ جمیلہ نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''السلام علیکم شاہ جی سرکار۔''

''جمیلہ...... ڈرائیور آئے تو اسے بتا دینا کہ میں نے چھٹی کی اجازت دے دی ہے اور یہیں اسکول کا نمبر بھی لکھا ہوگا۔ اسکول بھی فون کر دینا۔ اچھا...... خدا حافظ۔''

جمیلہ رابطہ منقطع ہونے کے باوجود دیر تک ریسیور کان سے لگائے کھڑی رہی۔ نعمان شاہ کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ لگتا تھا، وہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔

''کیا بات ہے امی۔'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' جمیلہ نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں چھٹی کی اجازت مل گئی ہے۔''

☆☆☆☆☆

جون کا مہینہ شروع ہو گیا۔ گرمیاں پہلے ہی ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔ دن بڑے ہو گئے تھے اور راتیں چھوٹی۔ سورج غروب ہوتے ہوتے آٹھ بج جاتے تھے اور صبح ساڑھے چار بجے سورج طلوع ہو جاتا تھا۔ چھ بجے تو دن چڑھ جاتا تھا۔

عمران کے سہ ماہی امتحان ہوئے۔ وہ کلاس میں فرسٹ آیا۔ امتحان کے بعد اسکول میں گرمی کی چھٹیاں ہو گئیں۔ عمران کے لیے وہ پُر لطف دن تھے۔ اتنے بڑے دن کہ سب کچھ کر لو، پھر بھی فرصت ملے۔ وہ گرد و پیش پر نظر ڈالتا اور حیران ہوتا۔ جادو کے زور سے جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ درخت ہرے بھرے تھے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ حتیٰ کہ پتھروں تک میں گھاس پھوٹ نکلی تھی۔ ابھی کچھ دن ہی پہلے کی بات تھی کہ ہر طرف مٹی کا رنگ تھا اور درخت سوکھے ہوئے تھے مگر اب دیکھ کر لگتا تھا کہ سب کچھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ وہ کوشش بھی کرتا تو ٹنڈ منڈ درخت اسے تصور میں نظر نہ آ پاتے۔ عجیب جادو تھا۔

ایک ماہ پہلے گندم کی فصل کٹی تھی۔ وہ عمران کے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ تھا۔ جمیلہ نے اسے بتایا کہ گندم ایک ماہ پہلے تیار ہو جانی چاہیے تھی لیکن فصل کو پکنے کے لیے جس دھوپ کی ضرورت تھی، وہ اپریل میں بارشوں کی وجہ سے نہیں مل سکی تھی۔ اس لیے فصل دیر میں تیار ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ فصل رب نواز اور جمیلہ نے مل کر کاٹی تھی۔ عمران کے اصرار پر بھی جمیلہ نے اسے

درانتی نہیں پکڑائی تھی۔ ''ابھی تم چھوٹے ہو بیٹے، دیکھو اور سیکھو۔ دو سال بعد تم بھی کٹائی میں ہاتھ بٹانا۔'' اُس نے کہا تھا سو عمران دیکھتا رہا۔ وہ درانتی کی مدد سے پکے ہوئے پودوں کو کاٹتے اور بہت سے پودوں کے ایک جیسے گٹھے بنا کر ایک طرف رکھتے رہے تھے۔ تین دن میں انہوں نے کام ختم کرلیا تھا۔

عمران نے بڑے غور سے کٹے ہوئے پودوں کو دیکھا تھا۔ ''اب ان کا کیا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

جمیلہ نے ایک بالی الگ کرکے اس میں سے گندم نکال کر اسے دکھائی۔ ''یہ گندم ہے۔ اسے پیس کر آٹا بنایا جاتا ہے۔ اسی کی روٹی کھاتے ہو تم۔''

''اس طرح سے گندم نکالیں گے تو...... یہ تو بہت ہے۔''

جمیلہ ہنسنے لگی۔ ''پگلے بیٹے...... کل تھریشر آئے گا۔ اس میں انہیں ڈالیں گے تو ایک طرف سے دانے نکل آئیں گے اور دوسری طرف یہ سوکھا بھوسہ......''

''اس کا کیا کریں گے؟''

''وہ بھینسوں کو دیں گے سبز چارے میں ملا کر۔''

تھریشرات کے وقت آیا تھا۔ اس رات عمران دیر تک جاگا تھا مگر اس نے اسکول کی چھٹی نہیں کی تھی۔

پھر اگلے مہینے جیسے ہی بارش ہوئی، اسی زمین میں ٹریکٹر چلایا گیا۔ جمیلہ نے گوبر کی کھاد لاکر زمین میں ڈالی اور مکئی بودی گئی۔ ''یہ فصل ہوگی تو میں تمہیں اپنی اس گھریلو کھاد کا کمال دکھاؤں گی۔'' جمیلہ نے کہا تھا۔ ''ایسی میٹھی اور مزے دار چھلی (بھٹے) کہیں اور نہیں ملے گی تمہیں۔''

اور اب تو مکئی کے پودے بھی زمین سے سر اٹھا چکے تھے۔

عمران اور جمیلہ ہر روز باغ میں جاتے تھے۔ خوبانی اور آلو بخارے نہ صرف لگ چکے تھے بلکہ خاصے بڑے ہوگئے تھے۔ جمیلہ جانتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں پھل تیار ہو جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ آنے والا ابھی آئے گا یا نہیں۔

نعمان شاہ ہفتے میں دو بار فون ضرور کرتا تھا۔ عمران کے فرسٹ آنے کی خبر سے وہ بہت خوش ہوا تھا لیکن اُس نے جمیلہ سے بات کرنے کو کبھی نہیں کہا تھا۔ ہاں...... رب نواز سے وہ اکثر بات کرتا تھا۔

عمران جب بھی اس سے پوچھتا کہ وہ کب آئے گا تو وہ یہی کہتا...... بیٹے، آج کل مصروفیت بہت ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ موقع ملتے ہی آؤں گا۔ کئی بار جمیلہ کے جی میں آئی کہ عمران کے ذریعے اسے یاد دلائے کہ پھل پکنے والے ہیں لیکن خودداری نے اسے روک دیا۔ وہ تو اس سے بات بھی نہیں کر رہا ہے اور وہ اسے یوں پیغام دے اور پھر اسے جو کہنا تھا، وہ پچھلی بار کہہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور تھی۔ نسوانی جبلّت اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ کوئی جان بوجھ کر بے رخی برتے، کسی کو نظر انداز کرے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس معاملے میں کمزور ہے۔ چڑ اس لیے رہا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کشمکش میں پڑ

گیا ہے۔ جمیلہ کو اس پر یقین تھا کہ پتھر کو جونک لگ چکی ہے۔ ورنہ وہ اسے پہلے کی طرح یوں بے نیازی سے برتتا، جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہے۔ اسے یوں نظر انداز ہرگز نہ کرتا کیونکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ جمیلہ خود ہی اپنا عہد توڑنے پر مجبور ہوگئی!

جولائی کا پہلا ہفتہ آگیا۔ آلو بخارے پک چکے تھے۔ خوبانی کے رنگ میں بھی ریشمی پن آگیا تھا۔ درخت حالانکہ پہلی بار پھل دے رہے تھے پھر بھی پھل لدکر آئے تھے۔ پھلوں سے لدے ہوئے درخت کا حُسن ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بچے تو بچے ہیں، انہیں دیکھ کر تو بڑوں کی نیت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ عمران کا کب سے جی چاہ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس باغ سے پہلا پھل پاپا کو توڑنا ہے۔ اس لیے وہ برداشت کیے جا رہا تھا مگر پھر یوں ہوا کہ بچے کی انا داؤ پر لگ گئی۔ وہ اپنی کلاس کے بچوں کو بتاتا رہتا تھا کہ اس کا پھلوں کا باغ ہے، جس میں آلو بخارے، خوبانی، انار اور سیب لگے ہیں۔ گرمی کی چھٹیوں کے بعد اس تذکرے میں روزانہ رپورٹ کا اضافہ ہوگیا۔ وہ پھلوں کے پکنے کے بارے میں تبصرے کرنے لگا۔ بچوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ عمران نے وعدہ کرلیا تھا کہ انہیں پھل ضرور کھلائے گا۔

بات کلاس ٹیچر تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ایک دن انہوں نے مذاق میں کہہ دیا۔ ''بھئی...... اب تو پھل بازار میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ تم کب کھلاؤ گے ہمیں پھل؟''

کچھ بچے ہنسنے لگے۔ وہ عمران کو جھوٹا سمجھتے تھے۔

عمران کے دل کو بڑی ٹھیس لگی۔ وہ گھر واپس آیا تو بجھا بجھا تھا۔ جمیلہ نے یہ بات محسوس کرلی لیکن اس سے پوچھا کچھ نہیں۔ کبھی کچھ خود بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سہ پہر کو وہ باغ میں گئے تو جمیلہ کو کچھ اندازہ ہوگیا۔ عمران پھلوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''پکے ہوئے پھلوں کو دیکھ کر تمہیں کیسا لگتا ہے بیٹے؟'' جمیلہ نے اسے کریدا۔

''بہت اچھا لگتا ہے۔'' عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کھانے کو بہت جی چاہتا ہے۔''

''چاہتا تو ہے لیکن...... پاپا کیوں نہیں آرہے؟''

''پاپا کو چھوڑو۔ میں ابھی تمہیں ڈھیر سارے آلو بخارے اور خوبانیاں توڑ کر دیتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی۔

''نہیں امی۔ مجھے تو بہت سارے پھل چاہئیں۔ اپنے اسکول کے دوستوں کو کھلاؤں گا اور مس کو بھی۔''

جمیلہ کی سمجھ میں بات کافی حد تک آگئی۔ باقی اس نے کرید کرید کر اگلوالی۔

''میں پاپا کو فون کرکے کہوں گی کہ فوراً آجائیں۔''

جمیلہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بیٹے، وہ بہت مصروف ہوں

گے۔ اس لیے نہیں آرہے ہیں۔ ورنہ تم سے دور تو وہ نہیں رہ سکتے۔" وہ پھر کچھ سوچنے لگی۔ اچانک بولی۔
"تم فکر نہ کرو بیٹے۔ میں ٹھیک کرلوں گی۔"

اس روز جمیلہ کو احساس ہوا کہ وہ عمران سے کتنی محبت کرنے لگی ہے۔ مامتا کا چھوٹا سا چشمہ جو اس کے سینے میں پھوٹا تھا، وہ محبت کی مسلسل بارش کے بعد غیر محسوس طور پر پہاڑی نالے کا روپ دھار گیا تھا۔ راستے کی کوئی رکاوٹ اب اسے روک نہیں سکتی تھی۔

یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ پانچ سال پہلے جب وہ اس باغ میں ننھے منھے پودے لگا رہی تھی تو اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ اس باغ سے پہلی بار سوائے نعمان شاہ کے کسی کو پھل نہیں توڑنے دے گی۔ اس وقت تو ننھے عمران کا وجود بھی نہیں تھا۔ نعمان شاہ کی محبت اس کی پہلی محبت تھی۔ اس لحاظ سے یہ عہد اس کا عہدِ محبت تھا۔ مگر اب عمران کی آزردگی کے سامنے کسی عہد کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ درخت پھلوں سے لدے ہوں اور وہ پھلوں کے لیے اداس ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ فیصلہ تو اُس نے لمحوں میں کرلیا کہ عمران کی خواہش پوری ہوگی اور بڑی شان سے ہوگی۔ البتہ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کہیں اس عہد سے منہ موڑنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ نعمان شاہ کی محبت آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے ختم ہو رہی ہے۔

لیکن نہیں ...... یہ تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ہاں...... اس نے عمران سے بھی تو ایک وعدہ کیا تھا...... وہ ہمیشہ اس کی امی رہے گی۔ اب یہ وعدہ جس کی عمر صرف تین چار ماہ تھی، برسوں پرانے عہد پر حاوی آرہا تھا۔ برسوں پرانی محبت صرف چھ ماہ کی محبت کے سامنے چھوٹی ہوگئی تھی لیکن اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

اگلے روز اس نے اسکول فون کیا اور ہیڈ ماسٹر سے بات کی۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "بی بی...... آپ کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں دوپہر کے بعد فون کرکے آپ کو بتا دوں گا۔"

ہیڈ ماسٹر نے فوراً ہی نعمان کو فون کیا اور اسے جمیلہ کی فرمائش کے متعلق بتایا۔ نعمان سے منظوری لینے کے بعد اس نے جمیلہ کو فون کرکے بتایا کہ اس کی فرمائش قبول کرلی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

وہ جمعرات کا دن تھا! عمران اپنے معمول کے مطابق اسکول پہنچا۔ گھنٹی بجنے تک وہ پلے گراؤنڈ میں بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اسمبلی کے بعد کلاس شروع ہوئی۔ کلاس ٹیچر مس نجمہ نے حاضری لی۔ پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور اعلان کیا "بچو...... آج پڑھائی کے بجائے تفریح ہوگی اور ایسی تفریح کہ تم لوگ خوش ہو جاؤ گے۔"

کلاس میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ بچے متجسس ہو رہے تھے۔

"آج ہم پکنک منائیں گے۔ اسکول سے دور جائیں گے۔"

کلاس میں ہنگامہ ہوگیا۔ بچوں کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

"لیکن شور نہ مچائیں پلیز۔ کیپ کوائٹ۔ شور مچائیں گے تو بڑے سر پروگرام کینسل کردیں گے۔"

کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ "اب آپ لوگ اپنا ہوم ورک چیک کرائیں۔"

ہوم ورک چیک کرنے میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ مس نجمہ نے کاپیاں واپس دیں اور کہا۔ "اپنی کتابیں اور کاپیاں بیگ میں رکھ لیں۔"

تمام بچے اپنے بستوں پر جھک گئے۔

"اب آپ لوگ تیار ہیں؟" تھوڑی دیر بعد مس نجمہ نے پوچھا۔

"جی مس۔" بچوں نے ایک آواز ہوکر کہا۔

"تو اب قطار بنا کر نکلیں، جیسے چھٹی کے وقت نکلتے ہیں۔ کوئی قطار سے باہر نہ نکلے۔ باہر بس کھڑی ہے۔ اس میں بیٹھنا ہے۔"

پندرہ منٹ بعد بس اسکول سے روانہ ہوگئی۔ مس اور ڈرائیور کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

کوئی بیس منٹ بعد عمران چونکا۔ وہ مس نجمہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ "ارے مس...... یہ تو میرے گھر کا راستہ ہے۔"

مس نجمہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "اچھا...... مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

کوئی تین منٹ بعد عمران چلایا۔ "مس...... یہ تو ہماری زمین ہے۔ یہ پہاڑ بھی ہمارا ہے۔"

"اچھا" مس نجمہ پھر مسکرائیں۔ کچھ بچے ہنسنے لگے۔

بس بڑی تھی اور راستہ تنگ۔ ڈرائیور نے ایک موڑ پر گاڑی روک دی۔ "مس...... اور اوپر نہیں جا سکتے۔ آگے پیدل جانا ہوگا۔"

مس بچوں کو لے کر نیچے اتر آئیں۔ عمران کی خوشی دیدنی تھی۔ "مس...... یہ ہماری زمین ہے۔ وہ دیکھیں گیراج...... وہاں میرے پاپا گاڑی کھڑی کرتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" مس نجمہ نے اس کا سر تھپتھپایا۔ پھر وہ بچوں کی طرف مڑیں۔ "عمران سچ کہہ رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "یہ زمینیں اسی کی ہیں اور اس نے اپنی وعدہ بھی پورا کردیا ہے۔ ہم اس کے باغ میں پکنک منائیں گے۔ درختوں سے پھل توڑ کر کھائیں گے لیکن کوئی بچہ شرارت اور بدتمیزی نہیں کرے گا۔ قطار لگا کر اوپر چلو۔ عمران سب سے آگے ہوگا۔ اسے راستہ معلوم ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے مس صاحبہ۔" ڈرائیور نے پوچھا۔

"تم یہاں اکیلے بیٹھ کر کیا کرو گے۔ ہمارے ساتھ چلو۔"

عمران کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مس نجمہ اس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ بچوں کی قطار پیچھے پیچھے

تھی۔عمران ایک ایک چیز کے بارے میں کمنٹری کرتا ہوا چل رہا تھا۔اوپر پہنچ کر اس نے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔"یہ ہمارا کھیت ہے۔اس میں مکئی بوئی ہے۔"

گھر کے دروازے پر جمیلہ،کلثوم اور رب نواز ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ڈرائیور کو رب نواز گھر میں لے گیا۔"آیئے۔۔پہلے باغ میں چلیں۔"جمیلہ نے مس سے کہا۔

یہاں قطار لگانے کا حکم غیر موثر ہو گیا۔بچے آپے سے باہر ہو گئے۔اب ان پر کوئی قابو نہیں پا سکتا تھا۔

باغ میں پہنچ کر جمیلہ نے کہا۔"جو بچہ درختوں پر چڑھ سکتا ہو،وہ بے شک چڑھ جائے۔بس اس درخت کو ہاتھ نہ لگانا۔"اس نے آلوچے کے ایک پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔"باقی سب تم لوگوں کے۔"جو بچے درخت پر نہیں چڑھ سکتے،انہیں میں پھل گرادوں گی۔"یہ کہہ کر وہ ایک قریبی درخت پر چڑھ گئی اور شاخیں ہلانے لگی۔خوبانیوں کی برسات ہو گئی۔ساتھ ہی لوٹ مار بھی شروع ہو گئی۔جمیلہ نے ایک صاف ستھری جگہ دری بچھا دی تھی لیکن بچوں میں سے کوئی اس طرف نہیں گیا۔البتہ مس نجمہ وہاں جا بیٹھی تھیں۔کچھ بچے درختوں پر بھی چڑھ گئے تھے۔کھا بھی رہے تھے اور شاخیں بھی ہلا رہے تھے۔عمران بھی ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا۔

تین چار درختوں سے پھل گرانے کے بعد جمیلہ مس نجمہ کے پاس جا بیٹھی۔"تو آپ عمران کی ٹیچر ہیں؟"اس نے کہا۔

"جی ہاں۔"مس نجمہ نے کہا۔"اور آپ عمران کی امی ہیں۔وہ بہت باتیں کرتا ہے آپ کی۔"

جمیلہ سناٹے میں آ گئی۔عمران کی خواہش پوری کرنے کے جوش میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔وہ سوچتی رہی کہ کیا کرے۔یہ بات خطرناک حد تک بگڑ بھی سکتی تھی۔یہ بات نہ ماں کو معلوم ہونی چاہیے،نہ بابا کو اور نہ......

"آپ تو بہت کم عمر لگتی ہیں۔میرے ذہن میں آپ کا بہت مختلف تصور تھا۔"مس نجمہ نے کہا۔

جمیلہ نے سمجھ لیا تھا کہ مس کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔"آپ اس بات کا بھرم رکھیے گا۔میں عمران کی ماں نہیں ہوں۔"اُس نے کہا۔مس نجمہ حیران اسے دیکھتی رہیں۔

"میں اسے محرومی سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"جمیلہ نے وضاحت کی اور پھر اسے تفصیل بتائی۔

مس نجمہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھتی رہیں۔"بڑی بات ہے۔میرے دل میں تو آپ کی قدر بڑھ گئی ہے۔"انہوں نے جمیلہ سے کہا۔"یہ بات مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے کہ اس سے عمران میں کتنا فرق پڑا ہے۔کتنی اچھی تبدیلی آئی ہے اس میں۔اللہ آپ کو اس کا بڑا صلہ دے گا۔"

"وعدہ کریں کہ یہ راز آپ کسی کے سامنے نہیں کھولیں گی۔"جمیلہ نے التجا کی۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔مجھے بھی عمران کی بھلائی عزیز ہے۔"

اُدھر عمران بہت خوش تھا۔اس نے خود تو بہت کم کھایا تھا اور دوسروں کو کھلانے میں لگا ہوا تھا۔اس نے جھولی بھر کر آلو بخارے اور خوبانیاں لا کر ان کے سامنے رکھ دیں۔پھر جھولی بھر کر گھر کی طرف چلا۔وہاں اسے رب نواز،کلثوم اور ڈرائیور کی تواضع کرنا تھی۔

ڈرائیور اس کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوا۔اس کے جانے کے بعد اس نے رب نواز سے کہا۔'اتنا سا بچہ ہے مگر مہمان نوازی جانتا ہے۔میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی خوشیوں میں گم کوئی اتنا سا بچہ اس ہنگامے میں دوسروں کو یاد رکھ سکتا ہے۔"

بچوں کے شور وغل کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔رب نواز نے حقے سے ایک کش لیا اور بولا۔"پیروں کی اولاد ہے۔"

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا۔"ٹھیک کہتے ہو جی۔ان کا تو بچہ بھی پیر ہی ہوتا ہے۔"

عمران اپنے دوستوں کو سب کچھ دکھا دینا چاہتا تھا۔وہ مس کے پاس آیا۔"مس میں اپنے دوستوں کو گھوڑوں کا فارم دکھانے لے جاؤں۔"

مس نجمہ نے گھڑی میں وقت دیکھ۔"سوری عمران......ہمیں ساڑھے بارہ بجے سے پہلے اسکول پہنچنا ہے تاکہ بچے اپنی بسوں میں بیٹھ کر گھر جا سکیں۔گھوڑوں کا فارم پھر کبھی دکھا دینا۔"

عمران کو مایوسی ہوئی لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔

انہوں نے بارہ بجے اسکول کی بس کو رخصت کیا۔کلثوم اور رب نواز بھی موجود تھے۔وہ گھر کی طرف واپس جا رہے تھے کہ عمران نے جمیلہ کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا۔"دری بھی تو اٹھانی ہے۔صفائی بھی تو کرنی ہے۔"اُس نے کہا۔

"ہاں نکے شاہ جی۔مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔چلو پہلے باغ میں چلیں۔"

باغ کا برا حال تھا۔جا بجا آلو بخارے اور خوبانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ادھ کھائے پھلوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔انہوں نے سالم پھل سمیٹ کر دری پر رکھے اور ادھ کھائے پھل اخروٹ کے درختوں کے پار اچھال دیے۔جمیلہ گھٹنوں کے بل بیٹھی دری سمیٹ رہی تھی کہ اچانک عمران اس کے پاس آیا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گیا۔جمیلہ اسے تھپتھپاتی رہی۔

"تھینک یُو......تھینک یُو امی"

جمیلہ کو اس کا جسم لرزتا محسوس ہوا۔اس نے پیچھے ہٹا کر اسے دیکھا،وہ رو رہا تھا۔"تم رو رہے ہو میرے بیٹے۔کیا ہوا؟بتاؤ......کیا ہوا......؟"جمیلہ بے تاب ہو گئی۔

"کچھ نہیں امی میں بہت خوش ہوں۔"عمران نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر اس سے لپٹ گیا۔

جمیلہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔عمران اب بھی رو رہا تھا۔اچانک

عمران نے اس کے سینے سے سر اٹھایا۔ ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بولا۔ ''آئی لو یو امی، آئی لو یو۔'' پھر بے تابانہ اس کا منہ چومنے لگا۔

جمیلہ کو لگا کہ وہ آسمانوں پر اُڑ رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

اگلے روز صبح دس بجے نعمان شاہ آ گیا۔

وہ جمعے کا دن تھا۔ عمران گھوڑوں کے فارم جا چکا تھا۔ رات ساتھ والے گاؤں میں ماتم ہو گیا تھا۔ جمعے کے بعد جنازہ تھا۔ کلثوم اور رب نواز وہاں گئے ہوئے تھے۔ جمیلہ گھر میں اکیلی تھی۔ وہ تو اسے دیکھ کر دھک سی رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آنے والا اس قدر بروقت آئے گا۔ اُس کا تو خیال تھا کہ وہ اس وقت تک نہیں آئے گا، جب تک پھل پک کر نہ گر جائیں۔

اُس نے نعمان شاہ کو بے دھیانی سے سلام کیا۔ وہ اس فکر میں تھی کہ اب اسے کیا جواب دے گی۔

''کیسی ہو جمیلہ؟'' نعمان نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں سرکار جی۔''

''عمران کہاں ہے؟''

''وہ تو جی محمود خان کی طرف گئے ہیں۔''

''اور چاچا چاچی؟''

''ساتھ والے گاؤں میں ماتم ہو گیا ہے، وہاں گئے ہیں۔''

''اوہ۔''

''آپ ہاتھ منہ دھو لیں۔ میں چائے بناؤں آپ کے لیے؟''

''نہیں چائے کی ضرورت نہیں۔'' نعمان نے کہا اور کمرے میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آیا۔ ''بہت مصروف ہو جمیلہ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں سرکار جی۔ ساگ تیار ہو گیا ہے۔ روٹی لگانی ہے بس۔'' جمیلہ نے کہا پھر پوچھا۔ ''کوئی کام ہے؟''

''ہاں...... کام تو ہے۔ میرے ساتھ باہر چل سکتی ہو؟''

جمیلہ کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ ''چاکروں کو انکار کرنا کہاں آتا ہے شاہ جی سرکار۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر چلو باغ میں۔ میں اسے پھلوں کا قبرستان بننے سے بچانے کے لیے آیا ہوں۔''

جمیلہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔

''ابھی وہ باغ ہی ہے یا پھلوں کا قبرستان بن چکا؟''

''ایسی بری بات منہ سے نہیں نکالیں سرکار۔''

''میں تو تمہاری بات دہرا رہا ہوں۔''

''غلاموں کے منہ سے نیچ بات نکل جائے تو آقا کو اسے دہرانا نہیں چاہیے۔'' جمیلہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

نعمان شاہ نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ کیوں؟ یہ وہ جاننا چاہتا تھا۔

وہ باغ میں داخل ہوئے۔ نعمان نے سر اٹھا کر بے ثمر درختوں کو دیکھا۔ ''ارے...... شاید پھل نہیں آئے۔''

''پھل تو لد کے آئے تھے سرکار جی۔''

''تو پھر؟'' نعمان شاہ نے سوالیہ انداز میں بھویں اچکاتے ہوئے دیکھا۔ ''تم نے کہا تھا کہ پہلا پھل میں توڑوں گا۔ اس کے بغیر اس باغ کے پھل نہیں اتریں گے۔''

جمیلہ کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ لرزش میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ''سرکار جی...... مجھے معاف کر دیں۔'' اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ ''لیکن میں چھوٹے بابا کا دل کیسے دکھاتی۔ میں نے اپنی وہ قسم توڑ دی، جو ٹوٹنے والی نہیں تھی۔''

''کیا مطلب؟ کس نے توڑا پہلا پھل؟'' نعمان نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''چھوٹے بابا جی نے سرکار۔''

''یہ باغ کیا اس کا ہے؟'' نعمان کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

''باغ تو آپ کا ہی ہے شاہ جی سرکار۔'' جمیلہ اب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ''لیکن چھوٹے بابا نے دوستوں سے پھل کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کی زبان جا رہی تھی، سرکار۔ اس لیے میں ہار گئی۔ میں شرمندہ ہوں۔ آپ بے شک مجھے جان سے مار دیں...... میں......''

''یہ کس نے کہا کہ باغ میرا ہے۔ باغ تمہارا ہے۔'' نعمان نے نرم لہجے میں کہا۔ جمیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''ہاں۔ یہ باغ تمہارا ہے۔ یہ تو تمہاری عزت افزائی تھی کہ تم پہلا پھل میرے ہاتھ سے تڑوانے کی ضد کر رہی تھیں۔ مجھے تم پر بالکل غصہ نہیں آیا۔ ہاں اب بتاؤ۔ ہوا کیسے...... اور کیا کیا ہوا؟''

جمیلہ اسے تفصیل بتانے لگی۔ وہ مسکراتا رہا۔ وہ بیٹے کی انمول خوشی کا تصور کر کے خوش ہو رہا تھا۔

جب ہیڈ ماسٹر نے اس کو جمیلہ کی تجویز کے متعلق بتایا تھا تو پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی اور جانتا تھا کہ جمیلہ بہت ضدی لڑکی ہے۔ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے کہ خود ہی وہ باغ لٹوا دے۔ پھر اس نے سوچا کہ پچھلی بار اس نے جمیلہ کے ساتھ جو توہین آمیز سلوک کیا تھا، یہ اس کا ردعمل ہے۔ یہ سوچنے کے بعد اسے کوئی گلہ بھی نہیں رہا تھا۔ مگر اب پوری بات سننے اور سمجھنے کے بعد اس کا وجود جمیلہ کے

لیے شکر گزاری سے بھر گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی صرف اپنی عمر سے بڑی نہیں، اپنے باطن میں بھی بڑی ہے۔ احسان کرنا بھی جانتی ہے اور وہ بھی کس قدر انکسار کے ساتھ۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں جمیلہ۔'' اس نے کہا۔ جمیلہ نے حیرت سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''جو محبت تم میرے ماں سے محروم بیٹے کو دے رہی ہو، میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا تمہیں۔ دنیا بھر کے خزانے تمہیں دے دوں، تب بھی۔''

جمیلہ نے دل میں سوچا...... صلہ تو آپ دے سکتے ہیں۔ ایک ایسا خزانہ ہے آپ کے پاس۔ ''کیسی باتیں کرتے ہیں سرکار جی۔'' اُس نے احتجاج کیا۔ ''میں تو خاک ہوں آپ کے قدموں کی اور میری آن چھوٹے بابا کی ضد سے اونچی تو کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔''

مجھ سے تو اونچی ہے۔ نعمان نے دل میں سوچا۔ ''آؤ...... اب چلیں۔''

''ٹھہریں سرکار جی۔ پہلا پھل تو آپ کو توڑنا ہے نا؟''

''مگر کہاں؟'' نعمان نے حیرت سے پوچھا۔

''آئیں میرے ساتھ۔'' جمیلہ نے کہا اور اسے آلوچے کے اس پیڑ تک لے گئی، جسے اس نے بچالیا تھا۔ ''اس درخت سے کوئی پھل نہیں توڑا گیا ہے۔ یہ آپ کا منتظر تھا۔''

نعمان حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ ''یہ کیسے......؟''

''اس پیڑ کو میں کسی کو کیسے ہاتھ لگانے دیتی۔ اس کی اجازت تو میں چھوٹے بابا کو بھی نہ دیتی۔'' وہ جذب کی سی کیفیت میں کہے جا رہی تھی۔ اس کے انداز میں اور لہجے میں عجیب سی وارفتگی تھی۔ ''جانتے ہیں...... یہ وہ درخت ہے، جس میں بہار کا پہلا پھول آیا تھا۔ وہ جو میں نے آپ کو دکھایا تھا۔ بہار آنے سے پہلے کھلنے والا پھول۔''

نعمان شاہ سن ہو کر رہ گیا۔ یہ کیسی مستقل مزاج لڑکی ہے۔ اسے اس پر غصہ آنے لگا لیکن پھر اسے اس کا عمران کے لیے کیا گیا ایثار یاد آیا تو وہ موم ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ پہلا آلوچہ میں توڑتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اچھلا اور اس کے پاؤں زمین پر لگے اور اس کے ہاتھ میں ایک آلوچہ تھا۔ وہ اس نے جمیلہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ تم کھاؤ گی۔''

''نہیں شاہ جی سرکار، یہ بے ادبی......''

''میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔''

جمیلہ نے ہاتھ بڑھا کر آلوچہ لے لیا۔ آلوچے کو منہ میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا...... کون جانے، یہ بہار کا وہی پہلا پھول ہو جو میں نے سرکار جی کو دکھایا تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اُسے لمحے نعمان شاہ بھی یہی بات سوچ رہا ہے۔ باغ سے نکلتے ہوئے نعمان شاہ نے کہا۔ ''تم بہت پیاری بچی ہو جمیلہ۔''

جمیلہ جھنجھلا کر تردید کرنا چاہتی تھی مگر نسوانی جبلّت نے اسے بتا دیا کہ اس بات پر نعمان شاہ کا اصرار اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے اسے بڑا تسلیم کر لیا ہے۔ اب وہ اسے بچی نہیں سمجھتا مگر اس حقیقت کو اپنے لیے خطرناک بھی سمجھتا ہے۔ لہٰذا کوئی ردِعمل ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے نعمان شاہ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ اس کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ سو وہ خاموش رہی۔

نعمان شاہ کو مایوسی ہوئی کہ جمیلہ نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن وہ کر کچھ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ گھر کے دروازے پر پہنچنے والے تھے۔ ''جمیلہ...... ایک بات بتاؤ۔'' نعمان نے کہا۔ ''میرا بیٹا کیسا لڑکا ہے؟''

''وہ آپ کا بیٹا ہے۔'' جمیلہ نے جواب دیا ''اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں'' اس کے لہجے میں بے پایاں محبت تھی۔

نعمان مسکرایا۔ ''اچھا جمیلہ...... میں ذرا محمود خان کے فارم کی طرف جا رہا ہوں۔ عمران کو لے کر آؤں گا۔''

جمیلہ نے سر گھما کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو...... بچی کے ساتھ تنہا رہنے سے ڈرتے ہو؟ اس کی نگاہوں میں چیلنج تھا اور وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور گھر میں چلی گئی۔

نعمان پلٹا اور پگڈنڈی کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆

''ٹھیک ہے سر۔ تھینک یو ویری مچ۔'' نعمان نے ماؤتھ پیس میں کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

یہ اُس کے لیے بہت خوشی کا دن تھا لیکن جو لوگ اپنے ساتھیوں سے...... ان لوگوں سے بچھڑ جائیں، جن سے انہیں محبت تھی، ان کے لیے ہر خوشی اداسی میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس نے شوکیس پر رکھے ہوئے فریم کی طرف دیکھا۔ وہ کتاب کی طرح کھلنے والا دوہرا فریم تھا۔ ایک طرف عمران کی وہ تصویر تھی، جو اس نے گاؤں لے جانے سے پہلے گھر میں کھینچی تھی۔ یہ تصویر ابتدا سے اس فریم میں لگی ہوئی تھی۔ فریم کے دوسرے صفحے میں تصویریں بدلتی رہتی تھیں۔ وہ جب بھی عمران سے ملنے گاؤں جاتا تو اس کی تازہ تصویر لے آتا۔ پھر اس فریم کی پرانی تصویر نکال کر وہ نئی تصویر لگا دیتا۔ اس وقت فریم میں جو تصویر تھی، وہ اسی سال کے موسم گرما کی تھی۔ فریم کے دونوں طرف ہمیشہ فل پوز ہوتے تھے تاکہ اسے احساس ہوتا رہے کہ عمران کتنا بڑا ہو گیا ہے۔

اس وقت دونوں تصویروں کو دیکھ کر اسے خوشی ہو رہی تھی۔ اُس کا عمران گاؤں گیا تو کتنا سا تھا اور اب ماشاءاللہ کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ قد کاٹھ بھی اس نے خوب نکالا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہر اعتبار سے

وہ قابلِ فخر بیٹا ثابت ہوا تھا۔ اسکول کی رپورٹس ہمیشہ اچھی رہی ہیں...... تعلیمی اعتبار سے بھی اور عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی۔ دوسری طرف وہ زمین میں...... فصلوں میں بھی دلچسپی لیتا رہا تھا۔ رب نواز کا کہنا تھا کہ وہ بڑا ہو کر بہت اچھا کاشت کار بنے گا۔ محمود خان کا کہنا تھا کہ وہ اس کا قابلِ فخر شاگرد ثابت ہوا ہے۔ اس عمر میں بھی وہ بہت اچھا گھڑ سوار ہے۔ اس کو گھوڑوں کی سمجھ بھی ہے اور اُن سے محبت بھی کرتا ہے۔

اور ایک بیٹے سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ نعمان شاہ نے طمانیت سے سوچا۔ میری محبت کے لیے اس ننھے سے بچے نے کیا کچھ نہیں کیا۔ تربیت کے ہر مرحلے میں بھرپور تعاون کیا۔ اور اب وہ تعلیم کے نئے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔

کہتے ہیں، وقت کے پر ہوتے ہیں اور وہ احساس دلائے بغیر اڑ جاتا ہے لیکن کوئی نعمان شاہ سے پوچھتا تو وہ بتاتا کہ یہ چھ سال پہاڑ جیسے تھے اور لمحہ لمحہ کر کے کٹے تھے۔ بیٹے کے بغیر وہ کیسے رہا تھا؟ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ان چھ برسوں میں عمران ایک بار بھی گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے گھر آنے کو کہا بھی نہیں تھا۔ بلکہ پچھلی بار تو اس نے الٹی فرمائش کی تھی۔

''پاپا...... آپ یہاں گھر کیوں نہیں بناتے؟''

''میرا خیال تھا تم یہاں مستقل رہنا نہیں چاہو گے۔''

''نہیں پاپا۔ مستقل تو میں صرف یہیں رہ سکتا ہوں۔''

اس کے بعد نعمان شاہ بہت تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی پر سروے کرایا، ایک بہت خوبصورت مکان کا نقشہ بنوایا اور پھر شہر کے سب سے نامور ٹھیکے دار کو مکان کی تعمیر کا کام سونپ دیا۔ ''یہ کام تمہیں ریکارڈ ٹائم میں مکمل کرنا ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

''کام مشکل ہے شاہ صاحب۔ گاڑیوں کے آنے جانے کے لیے راستہ نہیں ہے۔''

''تو پہلے راستہ بناؤ، اخراجات کی پروا نہ کرو۔''

کراچی آنے کے بعد بھی اس کا ٹھیکے دار سے رابطہ رہا تھا اور تین دن پہلے ٹھیکے دار نے اسے فون پر بتایا تھا کہ مکان ہر اعتبار سے مکمل ہو چکا ہے۔ بس فرنیچر اور مکینوں کی کمی ہے۔

اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے فون کیا تھا۔ ایک ہفتے بعد سالانہ امتحان کا نتیجہ آ رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس موقع پر ضرور آئے۔ اس بار یہ اہم تھا۔ کیونکہ عمران اس اسکول میں تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اب اسے ایبٹ آباد پبلک اسکول میں داخل کرانا تھا۔ سو وہ خوشی کا دن تھا۔ اس کا بیٹا بڑا ہو رہا تھا۔ سیکنڈری اسکول کے دور میں قدم رکھ رہا تھا مگر وہ اداس تھا۔ اسے اپنی مرحوم بیوی روبینہ یاد آ رہی تھی۔ وہ ہوتی تو آج کتنی خوش ہوتی۔ پھر اسے خیال آیا...... ممکن ہے، خوش نہ ہوتی۔ کہتی...... تم نے بیٹے کو گنواروں میں پالا ہے۔ کیا بنانا چاہتے ہو تم اسے...... دیہاتی...... پڑھا لکھا

دیہاتی۔ وہ ہمیشہ اس سے کہتی تھی۔ ''تم کہاں کے کہاں پہنچ گئے لیکن اندر سے اب بھی دہقان ہو۔ گاؤں سے رشتہ نہیں ٹوٹتا تمہارا۔'' وہ ہنس کر چپ ہو جاتا۔ اُس نے اس پر نہ کبھی بحث کی، نہ برا مانا۔ اس لیے کہ یہ سچ تھا۔

عمران کے بڑے ہونے کا احساس صرف اس تصویر سے نہیں تھا۔ یہ احساس تو موسم گرما میں گاؤں جا کر ہی ہو گیا تھا۔ اس سال وہ پورے ایک سال کے بعد گیا تھا۔ موسم سرما میں وہ نہیں گیا تھا۔ بہانہ کاروباری مصروفیات کا تھا لیکن درحقیقت وہ جمیلہ سے بچنا چاہتا تھا۔ ان چھ برسوں میں جمیلہ کہاں کہاں پہنچ گئی تھی۔ اب وہ ۲۲ سال کی بھرپور لڑکی تھی...... اور ایسی حسین کہ اسے دیکھ کر وقت بھی چلنا بھول جائے۔ مگر اس کی مستقل مزاجی نعمان کے لیے سب سے زیادہ حیران کن تھی۔ پہاڑی نالے کی طرح پرشور اور تند لڑکپن کی محبت اب بھی قائم تھی البتہ اب اس میں میدانی دریا کا سا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اس کی نظریں، اس کا والہانہ انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔ نعمان کو یہ سب کچھ برا لگتا تھا۔ بس ایک بات ایسی تھی، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ برداشت کر لیتا تھا۔ جمیلہ عمران سے غیر معمولی محبت کرتی تھی۔

گزشتہ موسم گرما میں نعمان شاہ گاؤں گیا تو اسے ایک بہت بڑی تبدیلی نظر آئی۔ عمران کا کمرا الگ ہو گیا تھا۔ عمران نے بڑے فخر سے اسے بتایا۔ ''پاپا...... یہ کمرا میں نے خود بنایا ہے۔''

وہ کمرا دیکھ کر نعمان حیران رہ گیا۔ اندر سے وہ اس مکان کا حصہ ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت ڈیزائن والا وال پیپر تھا، اور چھت پر پلین وال پیپر۔ کمرے کے ساتھ صاف ستھرا اٹیچڈ باتھ تھا۔ کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا۔ رائٹنگ ٹیبل اور دو کرسیاں۔ ایک صوفہ سیٹ اور اس کے ساتھ میز۔ ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی خوبصورت الماری تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ بک شیلف تھا۔

''واہ بھئی...... کمال کر دیا تم نے!'' نعمان نے داد دی۔

''پاپا...... یہ کمرا میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے لیکن اس کی ڈیکوریشن میں نے اور......'' عمران کہتے کہتے رک گیا۔ ''...... اور باجی نے مل کر کی ہے۔'' اس نے جملہ مکمل کیا۔

''بہت خوب۔''

یہ وہ موقع تھا جب عمران نے وہ جملہ کہا۔ ''پاپا...... آپ یہاں گھر کیوں نہیں بناتے؟'' مگر اس سے پہلے اس نے کہا تھا۔ ''پاپا...... اب میں اکیلا سوتا ہوں۔''

نعمان شاہ کو خوشی ہوئی۔ بچے کے بڑے ہونے کی سب سے بڑی علامت یہ تھی۔ اس نے سوچا، شاید جمیلہ کو اب اس کے ساتھ سوتے ہوئے حجاب آنے لگا ہوگا۔

''یہ تم نے اچھا کیا کہ اسے الگ ہونے کی عادت ڈال دی۔'' نعمان نے جمیلہ سے کہا تھا۔ ''اب وہ بڑا ہو رہا ہے۔''

اور جمیلہ نے جیسے اس کے دل کی بات جان لی۔ ''میرے لیے تو چھوٹے بابا اب بھی بچے ہیں اور

ہمیشہ رہیں گے۔" وہ بولی۔ "یہ تو میں نے ان کی بہتری کے لیے کیا ہے، جیسے آپ نے کیا تھا اور اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ پر کیا گزری ہوگی۔ کئی رات تو میں سو ہی نہیں سکی ان کے بغیر۔"

اور نعمان شاہ اپنے دل میں اس کے لیے شکرگزاری محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

سوچوں کا سلسلہ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ اُس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی سیکریٹری تھی۔ اس نے بتایا کہ پرسوں کی فلائٹ میں سیٹ مل گئی ہے۔ اس نے اس کا شکریہ ادا کر کے ریسیور رکھ دیا۔

اسکول کی تقریب میں ایک ہفتہ تھا مگر وہ اس سے پہلے وہاں پہنچ کر مکان کی آرائش کے کام کو مکمل کرالینا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆

مکان مکمل ہو چکا تھا۔ رنگ و روغن تک کر دیا گیا تھا۔ مکان دیکھ کر پہلی بار نعمان شاہ کو یاد آیا کہ اس کے کچھ خواب تھے، جو لاشعور میں دبے رہ گئے تھے۔ ایسے ہی ایک مکان کی تعمیر بھی اُس کا ایک خواب تھا۔ حالانکہ یہ مکان اُس نے بیٹے کی فرمائش پر تعمیر کرایا تھا۔ اس وقت اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ درحقیقت وہ اپنی ہی ایک خواہش کی تکمیل کر رہا ہے۔ یہ بات تو مکمل مکان کو دیکھ کر سمجھ میں آئی تھی۔ اب اسے پتا چلا کہ یہ مکان اپنی مٹی سے اس کے عشق کا مظہر ہے۔ اسے اپنی زمین پر فخر تھا کہ وہ دنیا کی حسین ترین زمین ہے۔ وہ اس زمین پر کوئی عام سا نہیں، اس کے شایان شان مکان بنانا چاہتا تھا۔ ایسا خوبصورت مکان جو اپنے گرد و پیش سمیت جنت کا حصہ لگے۔ مکان دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی خواہش پوری ہوگئی۔

وہ رب نواز کی طرف نہیں گیا۔ عمران سے نہیں ملا۔ اس لیے کہ اس مکان کے ذریعے وہ عمران کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مکان ہر اعتبار سے مکمل ہو۔ اس کا اہتمام اُس نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ نقشہ بنواتے ہی اُس نے نقشے کی ایک نقل ایک انٹیریر ڈیکوریٹر کو دی تھی۔ جتنے عرصے میں کنسٹرکٹر کو مکان تعمیر کرنا تھا، ڈیکوریٹر کو اس کی تزئین و آرائش کا نقشہ بنوا کر اس پر عمل کرانا تھا۔ ڈیکوریٹر کو ہر کمرے کی ضرورت اور اس کے سائز کے مطابق فرنیچر بنوانا تھا۔ تمام جزئیات کا خیال رکھنا تھا۔

اُس نے کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے ہی ڈیکوریٹر کو فون کر دیا تھا۔ ڈیکوریٹر نے اسے خوش خبری سنائی کہ ضرورت کی ہر چیز بنوالی گئی ہے۔ بس اسے مکان دکھا دیا جائے۔ پھر وہ سیٹنگ کرا دے گا۔ اس کا اندازہ تھا کہ تین دن لگیں گے لیکن کام ایک ہفتے پر پھیل گیا۔

اسکول کا رزلٹ آیا۔ عمران نے کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ نعمان شاہ بہت خوش تھا۔ اُس نے ہر اس ٹیچر کے لیے گفٹ کا اہتمام کیا، جس سے عمران نے پڑھا تھا۔ ایک تحفہ ہیڈ ماسٹر کے لیے بھی

تھا، جس نے ہمیشہ عمران کا غیر معمولی خیال رکھا تھا۔ سب ٹیچرز اس بات سے بہت خوش ہوئے لیکن عمران کی پہلی کلاس ٹیچر مس نجمہ سے نعمان کی جو گفتگو ہوئی، وہ آنکھیں کھول دینے والی تھی۔

"سر...... میں آپ کو پوری سچائی سے بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا بیٹا نہایت غیر معمولی ہے اور آپ اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ برسوں بعد عملی زندگی میں وہ ایک غیر معمولی فرد بنے گا۔"

نعمان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ "یہ اللہ کا کرم اور آپ لوگوں کی نوازش ہے۔"

"ہم ٹیچروں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ بس اپنا فرض ادا کیا ہے۔" مس نجمہ نے کہا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ اس بہت حسین اور پیاری لڑکی کو اس موقع پر فراموش نہیں کریں گے۔ اگرچہ جو کچھ اس نے کیا ہے، اس کا صلہ نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی چیز اس کے ایثار اور محبت کا حق ادا نہیں کر سکتی۔"

نعمان خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ "میں سمجھا نہیں۔" اُس نے کہا۔

"میں اُس لڑکی کی بات کر رہی ہوں...... وہ جو گھر پر عمران کی تربیت کرتی رہی ہے، کیا نام ہے اس کا...... ہاں جمیلہ۔"

"جمیلہ کو تو میں جانتا ہوں۔ لیکن آپ کی بات میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"میں آپ کو بتاتی ہوں۔ ابتدا میں جب بچے اپنی ماں کی باتیں کرتے تھے تو عمران بہت کھسیاتا تھا۔ دیر تک خاموش رہتا تھا مگر پھر اس میں مثبت تبدیلی آئی۔ وہ اپنی ماں کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس کی امی جیسی کسی کی ماں نہیں ہو سکتی۔ اس کی امی بہت خوبصورت ہیں۔ وہ دنیا کا ہر کام کر سکتی اور اسے سکھا سکتی ہیں۔ انہوں نے اسے درختوں پر چڑھنا سکھایا۔ خرگوش کا شکار کرنا اور پرندوں کو پکڑنا سکھایا۔ انہوں نے اسے فائر کرنا سکھایا۔ ان باتوں کے ساتھ ہی اس کی خود اعتمادی بہت بڑھ گئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھتی رہی کہ اس کے زرخیز ذہن نے محرومی کو قبول کرنے کی بجائے ایک امی تخلیق کر لی ہے لیکن امی کی باتیں کرتے ہوئے اس کے انداز میں بڑا یقین ہوتا تھا۔ پھر بھی میں امی کو فرضی کردار سمجھتی رہی۔ یہاں تک کہ باغ والی دعوت میں اُن سے ملاقات ہوگئی......"

نعمان شاہ سناٹے کے عالم میں یہ کہانی سن رہا تھا۔

"میں جمیلہ سے مل کر بہت متاثر ہوئی۔" مس نجمہ کہہ رہی تھیں۔ "وہ مجھ سے کم عمر ہیں لیکن میں ان کا بڑا احترام کرتی ہوں اُس دن سے۔ وہ آپ کے بیٹے سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ اس کی سگی ماں بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کا بیٹا اپنی امی پر فخر کرتا ہے۔"

"لیکن میں......"

"میری بات سنیں...... جو کچھ جمیلہ نے کیا، وہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا اجر صرف خدا دے سکتا

ہے۔ آپ دنیا کی تمام نعمتیں، تمام خزانے اس کی جھولی میں ڈال دیں، تب بھی اس احسان کا صلہ نہیں دے سکتے۔ نعمان صاحب، اب میں آپ سے ذاتی نوعیت کی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہیے۔ آپ کو مجھ سے ذاتی نوعیت کی گفتگو کرنے کا حق ہے اور آپ خاصی دیر سے اسے استعمال کر رہی ہیں۔" نعمان نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس اعزاز کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جمیلہ جس شخص کی بیوی بنے گی، وہ بلاشبہ بہت خوش نصیب ہوگا۔ آپ اُس سے شادی کر لیں۔"

"مشورے کا شکریہ۔" نعمان اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆

رزلٹ لے کر عمران گھر چلا گیا تھا۔ نعمان مکان پر چلا آیا، جہاں ڈیکوریٹر ریاض، آرائش کا کام کر رہا تھا۔ نعمان نے عمران سے کہلوا دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا کھا کر آئے گا۔ اس وقت اسے ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی۔ اس کے دل و دماغ میں طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ وہ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا کہ اس کے لیے ٹھیک سے کچھ سوچنا بھی ممکن نہیں تھا۔

شام کو کام والے رخصت ہو گئے لیکن نعمان رکا رہا۔ وہ اس وقت اس کمرے میں تھا، جو عمران کے لیے سیٹ کیا گیا تھا۔ اس کی آرائش کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

نعمان اب تک شاک کی حالت میں تھا۔ مس نجمہ کی گفتگو نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ معاملات اس حد تک بڑھ چکے تھے اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ غم و غصے میں اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ اس لمحے اسے جمیلہ سے بے پناہ نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

اُس کے خیال میں جمیلہ کو ایسا کوئی خواب دیکھنے کا حق نہیں تھا۔ خواب کا حق تو اسے جمیلہ سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے جب جمیلہ کو دیکھا تو اس کی بیوی کی موت کو دو سال ہو چکے تھے۔ ایک ایسے شخص پر ایک کم عمر لیکن بے پناہ حسین لڑکی ملتفت ہو تو اسے کم از کم خواب دیکھنے کا حق تو ملنا چاہیے۔ لیکن اس نے روایات اور آبا و اجداد کی محبت کی خاطر خود پر جبر کیا، آنکھوں کو خواب سے محروم رکھا۔ ورنہ خواب تو کیا، اس کے لیے تو تعبیر بھی کچھ مشکل نہ تھی۔ تو پھر جمیلہ نے وہ خواب دیکھنے کی جسارت کیسے کی۔ عمران سے خود کو امّی کہلوانے کا کیا مطلب تھا۔ وہ سوچتا اور جلتا کڑھتا رہا لیکن اس کا انداز حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ وہ خود کو جمیلہ کے برابر سمجھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس نے پوزیشن کے بہت بڑے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ وہ یہ بھول رہا تھا کہ جو جتنا اوپر ہوتا ہے، خواب کے حق سے اتنا ہی محروم ہوتا ہے اور جن کی کوئی پوزیشن نہیں ہوتی، ان کے پاس سوائے خواب دیکھنے کی صلاحیت کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بس خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔

شاید نعمان شاہ کی برہمی کا سبب یہ تھا کہ جمیلہ اسے اچھی لگتی تھی۔ شاید وہ اس سے محبت بھی کرتا تھا لیکن اُس کی گویائی بزرگی نے سلب کر رکھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں عزت کی ہتھکڑیاں تھیں۔ پیروں میں عالی نسبی کی بیڑیاں تھیں۔ وہ بہت مجبور تھا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جمیلہ سے محبت کرنا، اسے مانگنا تو بہت دور کی بات تھی، وہ تو اس خوف سے لرزتا تھا کہ کہیں اس کے کسی انداز سے ایسی کوئی بات عیاں نہ ہو جائے۔ وہ اس بات پر مشتعل تھا کہ اسے کسی سے محبت کرنے کا حق نہیں تو کسی اور کو اُس سے محبت کرنے کا حق کیوں حاصل ہے اور وہ اسے روک کیوں نہیں سکتا۔

دس بج گئے۔ اسے رات اب یہیں گزارنی چاہیے تھی لیکن وہ جمیلہ کی خبر لینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اسے اُس کی اوقات یاد دلا دی جائے۔ یہ کام نسبتاً نرمی سے اس نے پہلے بھی کیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں جمیلہ کا جوش سرد بھی پڑ گیا تھا لیکن چالاک لڑکی نے کھیل کا انداز تبدیل کر دیا تھا اور عمران کو استعمال کیا تھا۔ اوقات یاد دلانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ جمیلہ کی وارفتگی اُس کے لیے ایک ایسی ترغیب بھی بن سکتی تھی، جس سے لڑنا اس کے لیے ناممکن بن سکتا تھا۔

اس نے دروازے مقفل کیے۔ گیٹ پر تالا ڈالا اور رب نواز کے گھر کی طرف چل دیا۔ ٹارچ اس نے لے لی تھی۔ ورنہ اندھیرے میں اتنی دور جانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر نعمان شاہ کو اس وقت کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ بس وہ جلد از جلد جمیلہ کو ذلیل کرنا اور اپنی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور سب لوگ سو چکے تھے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور سیدھا جمیلہ کے کمرے کی طرف گیا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ جمیلہ پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی کتاب ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ خود جمیلہ بھی بے ترتیبی کے عالم میں تھی۔ چادر اُس کے پیروں میں سمٹی ہوئی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ ٹھوڑی پر تھا اور سر گاؤ تکیے پر ٹکا تھا۔ اس بے نیازی اور بے ترتیبی میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

نعمان شاہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ جمیلہ کے لیے وہ غصہ، وہ نفرت...... سب کچھ پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ دل و دماغ پر اُس ساحرانہ حسن کے لیے وارفتگی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ وہ سحر زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک دل میں نجانے کیسی کیسی خواہشیں ابھریں۔ وہ کسی جادو کی ڈور سے بندھا دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔

اب وہ بے سدھ سوئی جمیلہ کے اتنا قریب پہنچ چکا تھا کہ ذرا سا ہاتھ بڑھاتا تو اسے چھو لیتا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس کا ہاتھ بڑھا......

اچانک اُس کے اندر جیسے کوئی بلند آواز میں چیخا اور اُس کے ساتھ ہی وہ ساکت ہو گیا۔ پھر اُس کے حواس بھی کام کرنے لگے۔

وہ پتھر کا بت بنا کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ اور گناہ کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ بھی نہیں تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ شرمسار کھڑا اپنے ہاتھ کو پیچھے کھینچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اپنے ہاتھ پاؤں پر اسے اختیار نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر وہ ایسے ہی کھڑا رہا۔ لگتا تھا کہ بھیانک جرم کی پاداش میں اسے پتھر بنا دیا گیا ہے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کیا وہ صبح تک...... جمیلہ کے، عمران کے، چاچا رب نواز کے، چاچی کلثوم کے جاگنے تک یونہی کھڑا رہے گا؟ اپنی نظروں میں گرنے کے بعد کیا وہ اپنے لوگوں کی نظروں سے بھی گر جائے گا؟ یہ تصور بے حد اذیت ناک تھا۔ ایسی زندگی سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔

وہ کوشش کرتا رہا پھر اچانک جیسے اُس کے ہاتھ پاؤں ان دیکھی زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔ اس نے ہاتھ پیچھے کھینچا اور تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

اُس کے کمرے سے جانے کے بعد جمیلہ نے گہری سانس لی اور آنکھیں کھول دیں۔

اُس نے نعمان شاہ کو کمرے میں آتے تو نہیں دیکھا تھا۔ وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے اس پر نیند حاوی آ گئی تھی۔ اسے کتاب کے چھوٹ جانے کا بھی پتا نہیں چلا تھا۔ لیکن کسی انجانی حِس نے اسے جگا دیا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا، جب نعمان اندر آ چکا تھا۔ اس نے آنکھوں کے گوشوں سے نعمان کو دیکھا۔ نعمان کے چہرے پر غضب ناکی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اسے بت کی طرح ساکت ہوتے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ غضب ناکی کی جگہ وارفتگی نے لے لی تھی۔

جمیلہ نے جان لیا کہ نعمان شاہ نے اس کی بے حجابی پر بھرپور نظر ڈالی ہے۔ وہ بہت نازک لمحے تھے۔ جمیلہ کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ آنکھیں پوری طرح کھول دے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ اچانک اٹھی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ بدستور سوتی بنی رہے۔ پہلا راستہ آسان تھا اور دوسرا بے حد دشوار لیکن فیصلہ مشکل نہیں تھا۔ نعمان شاہ نے اُس سے محبت کی تھی اور نعمان شاہ ایک سربلند انسان تھا۔ وہ اس سے جتنی محبت کرتی تھی، اس سے ہزاروں...... لاکھوں گنا اس کا احترام کرتی تھی۔ وہ آنکھیں کھول دیتی تو وہ خود کو حقیر سمجھنے لگتا۔ سربلند سے سرنگوں ہو جاتا۔ یہ وہ کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مشکل راستہ اپنایا۔ وہ سوتی بنی رہی لیکن اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیامت کا تھا۔ کسی کے سامنے سوتا بننے کی کوشش کی جائے تو پلکیں خود بخود لرزنے لگتی ہیں۔ سانسیں اتھل پتھل ہو جاتی ہیں۔ دھڑکنوں کی لے اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ لگتا ہے، دل دھڑکنے کی آواز پوری دنیا کو سنائی دے رہی ہے۔ یہاں تو ایک مشکل اور بھی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اچانک شروع ہونے والا یہ ایکٹ کس انداز میں مکمل ہو گا۔ کوئی انسان کیسا ہی سربلند ہو، ہوتا تو انسان ہی ہے۔ نعمان بھی انسان تھا اور انسان کمزور لمحوں میں بہت زیادہ کمزور ہوتا ہے۔

جمیلہ جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے، نعمان شاہ اس کے لیے اتنا ہی محترم رہے گا۔ وہ اس سے اتنی ہی محبت کرے گی۔ بلکہ ممکن ہے، اس کی محبت بڑھ جائے۔ البتہ آنکھیں ملنے کی صورت میں معمولی سی لغزش بھی نعمان شاہ کو توڑ کر رکھ دے گی۔ سو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بھی صورت میں نعمان کی موجودگی میں آنکھیں نہیں کھولے گی۔

وہ خود بھی بت بن گئی! وہ لمحے تھے یا صدیاں تھیں۔ اس میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ آنکھیں نیم وا کر کے اسے دیکھتی۔ پلکوں کو ایک بار آزادی دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ بے اختیار ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ سانس روکے جوں کی توں لیٹی رہی۔ بالآخر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً چند لمحوں تک آنکھیں نہیں کھولیں اور جب آنکھیں کھولیں تو اس نے سب سے پہلے خود کو دیکھا اور حجاب سے نیم جاں ہو گئی۔ اس نے پیروں میں سمٹی ہوئی چادر کو کھینچ کر اس میں خود کو چھپا لیا۔

ذرا سوچنے کے قابل ہوئی تو اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس معاملے میں وہ مجرم تھی۔ اگرچہ اس میں بڑا دخل اس کی کم عمری کا تھا۔ ایک الہڑ لڑکی کی حیثیت سے اس نے نعمان شاہ کو قدم قدم پر جتایا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ ہاں...... جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی، سمجھ دار ہوتی گئی، اس کا طرز عمل محتاط ہوتا گیا لیکن اس وقت تک نعمان کے سامنے ترغیب تو آ چکی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا۔

''شاہ جی سرکار۔ اپنی نادانی کی کیا سزا دوں خود کو۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''آپ ہی کوئی سزا دے دیجیے مجھے۔''

اسے نہیں معلوم تھا کہ شاہ جی سرکار صبح ہی اسے سزا دیں گے۔

☆☆☆☆☆

نعمان شاہ اس رات ایک پل بھی نہ سو سکا۔ وہ محاسبے کی رات تھی۔ وہ...... سید نعمان حسین شاہ بہت پست ثابت ہوا تھا۔ بہت نیچے گر گیا تھا۔ وہ اونچ نیچ کو اس طرح نہیں مانتا تھا۔ پھر بھی روایت کا امین تو تھا اور روایت کے مطابق رب نواز اور اس کے بچے اس کی رعیت تھے۔ ان کے جان و مال اور عزت کی حفاظت اس کا فرض تھا اور وہ کیا ثابت ہو رہا تھا۔ لٹیرا؟ کوئی اور ہوتا تو وہ سوچتا کہ اللہ نے اسے لغزش سے بچا لیا لیکن اس کا نکتۂ نظر مختلف تھا۔ اس کا ہاتھ گناہ کی سرحد سے لوٹ آیا تھا لیکن آنکھوں نے تو گناہ کیا تھا اور مسلسل کیا تھا اور گناہ دماغ نے بھی کیا تھا۔ اُس کی سوچوں نے بھی کیا تھا۔ جواب تو دینا پڑے گا۔ سزا تو ملے گی۔

وہ سوچتا اور جھنجلاتا رہا۔ اسے جمیلہ پر غصہ آتا رہا۔ حالانکہ جمیلہ پر غصے نے ہی اسے اس حال کو پہنچایا تھا۔ وہ اسے ذلیل کرنے اس کے کمرے میں گیا تھا اور خود ذلیل ہو کر واپس آیا تھا۔ اسے اپنے کردار پر جو مان تھا، وہ اُس کے لیے بڑی قیمتی چیز تھا۔ وہ اس نے گنوا دیا تھا اور اب پھر وہ جمیلہ پر غصہ کر رہا تھا۔

غصے کی تاویل کا ایک انداز ہوتا ہے۔ غصہ ہر چیز کو رد کر سکتا ہے۔ سید نعمان حسین شاہ کے اندر معقولیت موجود تھی لیکن غصے کے سامنے معقولیت کی ایک نہیں چل رہی تھی۔ جمیلہ اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ معقولیت کہتی تھی کہ محبت پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ محبت کرنے والے کا حق ہے

اور یہ محبوب کا حق ہے کہ وہ چاہے تو اس کی محبت کو قبول کرلے اور چاہے تو ٹھکرا دے۔ لیکن غصہ کہتا تھا کہ وہ اسے ورغلاتی رہی ہے...... ترغیب دیتی رہی ہے اس لیے قصوروار ہے۔ اُس نے اندر ہی اندر اسے کمزور کردیا اور اس کمزوری نے، جس سے وہ بے خبر رہا، اسے اپنی ہی نظروں میں حقیر کردیا۔ معقولیت کہتی تھی کہ یہ اس کا قصور ہے۔ اسے اس محبت کو شعوری اور غیرشعوری طور پر رد یا قبول کرنا چاہیے تھا۔ خود کو سمجھانا چاہیے تھا۔ یہ اُس کی ذمے داری تھی لیکن غصہ اس پر غور کرنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر یہ حقیقت تھی کہ جمیلہ نے عمران کو اولاد کی طرح چاہا اور غیرمعمولی محبت سے اسے جیتا۔ غصہ کہتا تھا کہ اس کی محبت کا محرک اُس کی غرض تھی۔ جمیلہ نے عمران کو اس تک پہنچنے کی سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ہوش مندی کہتی تھی کہ بدگمانی کا اسے کوئی حق نہیں۔ کیونکہ یہ بات وہ ثابت نہیں کرسکتا اور اس سے قطع نظر جمیلہ نے اُس پر احسان کیا ہے...... اس کے بیٹے کو بہت بڑی محرومی سے بچا کر...... اور اس کا صلہ وہ جمیلہ کو نہیں دے سکتا۔ دنیا کی تمام نعمتیں، تمام خزانے اسے دے کر بھی وہ اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ مس نجمہ نے بھی یہی کہا تھا لیکن غصہ کہتا تھا، احسان کیا۔ جمیلہ نے تو بہت منفعت بخش سرمایہ کاری کی ہے۔

اُس کا غصہ صبح تک فرو نہ ہوسکا۔ بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ صبح اٹھنے کے بجائے وہ بستر میں لیٹا سونے کی اداکاری کرتا رہا۔ یہاں تک کہ عمران اسے اٹھانے کے لیے آگیا۔

''پاپا...... ام...... باجی کہہ رہی ہیں کہ ناشتہ کرلیں۔''

عمران کے منہ سے نامکمل امی سن کر نعمان کا غصہ اور بھڑک اٹھا مگر بچے پر غصہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔''

''پاپا...... میں فارم جارہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... تم جاؤ۔''

عمران کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک بستر پر لیٹا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور عمران کے کمرے میں چلا گیا۔ باتھ روم سے نکل کر اس نے کپڑے بدلے اور باہر آیا۔ برآمدے میں وہ پلنگ پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ باورچی خانے میں سے جمیلہ نکل کر آئی۔ ''ماں اور بابا تو دعا کے لیے گئے ہیں۔'' اُس نے بتایا۔

جمیلہ کا سامنے آنا غضب ہوگیا۔ نعمان شاہ کے اندر جو لاوا ابھرا تھا، پھٹ کر نکل گیا۔ ''تو تم عمران کی امی ہو؟'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

جمیلہ سناٹے میں آگئی۔ اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یوں پھٹ پڑے گا۔ اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔

''اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تم؟''

جمیلہ نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ یہ تو وہ سزا تھی، جس کی وہ آرزو کررہی تھی۔ ''سرکار جی...... شادی

کوئی بری بات تو نہیں۔'' اُس نے کہا۔ ''یہ تو اپنے نبیؐ جی کی سنت ہے۔ اور نبیؐ جی نے لڑکی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی بتائیں۔ کسی کو پسند کریں۔''

''مگر مجھ سے تمہارا کیا جوڑ؟''

''ہاں، سرکار جی۔ جوڑ تو کوئی نہیں۔ زمین کا آسمان سے کیا میل......''

''میں تم سے بڑا ہوں۔ تمہارے باپ کی طرح ہوں......''

''نہیں سرکار جی۔ آپ بابا سے بہت چھوٹے ہیں۔ جتنی میں آپ سے چھوٹی ہوں، اس سے زیادہ آپ بابا سے چھوٹے ہیں۔''

نعمان شاہ کو اس کی ڈھٹائی پر طیش آگیا۔ ''تمہیں نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری عزت کی پرواہ ہے۔'' وہ چلایا۔

''اپنی تو کوئی عزت نہیں آپ کے سامنے۔ ہاں، آپ کی عزت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ جب بات سمجھ میں آگئی کہ زمین آسمان کو نہیں چھو سکتی تو میں نے یہ خیال بھی چھوڑ دیا۔''

اب نعمان شاہ کو خود پر قابو نہیں تھا۔ ''خیال نہیں چھوڑا۔ تم نے وہ ترکیب کی کہ تمہیں کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور مطلب پورا ہوجائے تمہارا۔ تم نے میرے معصوم بچے کو استعمال کیا۔ تم اس کی امی بن بیٹھیں۔ اور تم بی بی صاحبہ بننا چاہتی ہو۔ اپنی اوقات بھول کر......'' وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا۔

اس بار جمیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے عمران کو جو کچھ دیا، کتنے خلوص سے دیا تھا۔ یہ اللہ جانتا تھا۔ اُس نے سوچ لیا کہ اس کی تردید کرکے...... عمران سے اپنی محبت کی سچائی بیان کرکے وہ کم ظرفی کا مظاہرہ کرے گی۔ اس لیے چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ دوسرے وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ نعمان شاہ اپنی رات کی کمزوری پر جھنجلایا ہوا ہے۔ اس لیے اسے ذلیل کررہا ہے۔ یہ تو حقیقت تھی نا کہ اسی کی وجہ سے وہ اتنا گرا تھا۔ اس میں اس کا قصور ہو یا نہ ہو، ذمے دار تو وہی ہے۔

لیکن ایسی سخت باتیں اس نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ منتوں مرادوں والی۔ اس لئے دعائیں کی گئی تھیں۔ اس سے کبھی سختی سے بات نہیں کی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو رخساروں پر بہنے لگے لیکن اس کے منہ سے کوئی سسکی بھی نہیں نکلی۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ نعمان شاہ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ بکتے بکتے رک گیا۔ اُس کے اس طرح رونے پر اسے شاک لگا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ وہ کتنی لاڈلی ہے۔

''شاہ جی سرکار۔ مجھے معاف کردیں۔'' جمیلہ گڑگڑائی۔ ''میں بہت بری ہوں سرکار جی۔ اتنی بری کہ آپ کو کبھی معلوم ہی نہیں ہوسکتا۔ واقعی میں نے یہ سب کچھ کیا۔ مجھے آپ جو سزا دیں، کم ہے۔ میں بہت جھوٹی اور مطلبی ہوں۔ آپ مجھے ماریں نا سرکار جی۔ کچھ بھی کریں، مجھے معاف کردیں۔ اللہ جی سے بھی مجھے معافی دلادیں۔ اب کبھی کوئی غلطی نہیں کروں گی۔ میں آپ کے چاکروں کی بیٹی ہوں...... آپ

کے بیٹے کی چاکر ہوں۔ میرے ماں باپ کی خدمت کے بدلے مجھے معاف کر دیں......'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

نعمان شاہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد عمران آ گیا۔ ''چلو بیٹے...... تمہیں اسکول داخل کرانے لے چلوں۔'' نعمان نے اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے پاپا۔''

☆☆☆☆☆

ایبٹ آباد پبلک اسکول میں داخلہ کچھ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ عمران پوری طرح سے اس کا مستحق تھا۔ ایک ہفتے بعد اسکول کی موسم سرما کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ اسکے بعد یکم مارچ سے کلاسیں شروع ہوتیں۔ اسکول سے نعمان عمران کو بازار لے گیا۔ وہاں اس نے اس کے لیے یونیفارم، اسکول کی کتابیں، کاپیاں اور دیگر چیزیں خریدیں۔ کچھ کپڑے بھی دلائے۔ پھر اُس نے اسے ایک بہت خوبصورت رسٹ واچ خرید کر دی۔ ''یہ فرسٹ آنے پر تمہارا انعام ہے۔'' اس نے کہا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ عمران خوش نہیں ہے۔ نعمان کو ایک ہفتہ یہاں گزارنا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسکول کی چھٹیاں ہوتے ہی عمران کو کراچی لے جائے گا اور پھر اسکول کھلنے کے موقع پر واپس لائے گا۔ ادھر مکان کا کام بالکل مکمل ہو گیا تھا۔ نعمان نے اس کے لیے دو افراد کو ملازم رکھ لیا۔ انہیں اس نے راز داری کی سختی سے تاکید کر دی۔ ان کا کام گھر کو صاف ستھرا اور بالکل تیار رکھنا تھا۔

اصولاً نعمان کو بہت خوش رہنا چاہیے تھا لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ اس کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ اس کے تصور میں بار بار جمیلہ کا چہرہ آ جاتا۔ وہ اُس کا خاموشی سے رونا...... رخساروں سے بہہ کر آنسوؤں کا ٹپ ٹپ گرنا۔ وہ آنسو اسے اپنے دل پر گرتے محسوس ہوتے۔ پھر اسے جمیلہ کا الٹا اس سے معافی مانگنا یاد آتا تو اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اب جبکہ غصہ فرو ہو چکا تھا اور وہ معقولیت سے سوچ سکتا تھا۔ اگر اس نے زیادتی کی حد کر دی تھی تو جمیلہ نے احترام کی۔ اسے عمران کے لیے جمیلہ کی محبت اور اس کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ جمیلہ نے تو اس پر احسان کیا تھا اور اس نے اتنے بڑے احسان کا یہ صلہ دیا تھا اسے۔

اب وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اتنا مشتعل کیوں تھا۔ اتنا غصہ کیوں آ رہا تھا اسے؟ اُس رات کے ان کمزور لمحوں میں اپنے حقیر ہو جانے کی وجہ سے! لیکن اس میں جمیلہ کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ جمیلہ نے تو کبھی نہیں چھپایا تھا کہ وہ اُس سے محبت کرتی ہے۔ جمیلہ نے محبت کو برائی نہیں، عظمت سمجھا تھا اور اس کا احترام کیا تھا۔ وہ شادی کو نبیؐ جی کی سنت سمجھتی تھی...... ایک قابل فخر رشتہ...... جمیلہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ بہت کچھ نہیں جانتی تھی پھر بھی اس نے سب کچھ ٹھیک رکھا تھا۔ اس کے ذہن میں مکڑی کا کوئی جالا نہیں تھا۔ اس نے ضمیر کے لیے کوئی خلش نہیں پالی تھی۔ اسی لیے اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ صرف اور صرف محبت کی وجہ سے وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن کر اس سے معافی مانگتی رہی تھی۔

دوسری طرف وہ تھا...... تعلیم یافتہ، سمجھدار اور سب کچھ جاننے والا۔ اسے بھی معلوم تھا کہ شادی ایک بہت اہم ادارہ ہے۔ شادی انسان کو برائیوں سے بچاتی ہے۔ انسان کو مضبوطی دیتی ہے۔ خوشیاں عطا کرتی ہے۔ کردار کی تعمیر کرتی ہے۔ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس سے آدمی بھاگے تو وہیں پہنچ جاتا ہے، جہاں اس رات وہ پہنچا تھا۔ آدمی اپنی نظروں میں گر جاتا ہے اور زیادہ کمزور ہو جائے تو گناہ کے تاریک غار میں جا گرتا ہے۔

اب وہ اپنا تجزیہ کر سکتا تھا۔ جمیلہ کی محبت سے وہ ابتدا میں ہی آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی محبت سے لڑا نہیں، بھاگتا رہا۔ وہ اوپر سے اس سے بے نیازی برتتا۔ اسے بچہ سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا لیکن اندر ہی اندر اس کی محبت کا اسیر ہوتا گیا۔ اندر ہی اندر وہ محبت اس کے دل میں گھر کرتی گئی اور وہ بے خبر رہا۔

وہ جانتا تھا کہ محبت ایک عظیم نعمت ہے، جو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ مگر وہ اس کو قبول کرنے سے بچنے کے لیے عذر پر عذر تراشتا رہا۔ اس کا پہلا عذر آباؤ اجداد کی عزت اور علاقے کی روایات کی پاسداری تھا۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ روایات انسان سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں اور آباؤ اجداد کی عزت شادی کی سنت سے نہیں، بدکرداری سے، اخلاقی کمزوریوں سے اور برے اعمال سے مجروح ہوتی ہے۔ دوسرا عذر اس کا یہ تھا کہ جمیلہ بہت کم عمر ہے اور اس کی محبت ایک وقتی جذبہ ہے، جو پختگی آنے کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ تیسرا عذر یہ تھا کہ وہ بیٹے کو روایتی سوتیلی ماں سے بچانا چاہتا تھا مگر جب جمیلہ نے اپنے عمل سے اس عذر کو بے معنی ثابت کر دیا تو اس نے یہ عذر تراشا کہ وہ اس تک پہنچنے کے لیے عمران کو سیڑھی کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ یعنی عمران سے اس کی محبت کھوٹی تھی اور اس سے شادی بھی وہ محبت کی وجہ سے نہیں وہ محلوں میں بسنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ یعنی اس سے بھی جمیلہ کی محبت سچی نہیں تھی۔

مگر جمیلہ نے اُس کے الزامات کی تردید کی بجائے تائید کر کے...... اور جرم کی معافی مانگ کر ہر عذر کو ختم کر دیا تھا۔

ایک اہم سوال...... ایک اہم تجزیہ اور تھا۔ اُس رات جمیلہ کے کمرے میں وہ بہکا کیوں تھا؟ سوال یہ تھا کہ اگر جمیلہ کی جگہ کوئی اور ہوتا، تب بھی وہی کچھ ہوتا؟ اس سوال کا جواب اہم بھی تھا اور مشکل بھی۔ نعمان شاہ خود کو ٹٹولتا رہا۔ بیوی کی موت کو آٹھ سال ہو چکے تھے مگر اس نے کبھی عورت کو مرد کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اسکے لیے بہکنا بھی مشکل نہیں تھا اور بہکنے کا سامان کرنا بھی دشوار نہیں تھا۔ لیکن اس کے اندر کبھی ایسی کوئی خواہش نہیں ابھری تھی۔ اگرچہ یہ تشویش ناک حد تک غیر فطری بات تھی مگر وہ پوری سچائی سے یہ بات کہہ سکتا تھا وہ دولت مند آدمی تھا۔ بڈھا بھی نہیں تھا۔ بدصورت بھی نہیں تھا۔ کراچی میں کئی لڑکیوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی۔ خود اُس کی سیکریٹری نے جو بہت خوبصورت تھی، اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تو برف کا بت تھا...... حرارت سے محروم! تو پھر جمیلہ کے معاملے میں وہ کمزور کیوں ہوا؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے اسے اپنے بہت اندر اترنا پڑا اور

جواب اس کے لیے بہت حیران کن تھا۔ کب...... یہ وہ نہیں جانتا تھا...... لیکن وہ جمیلہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اُس کی وہ حرکت کسی ہوس کے مارے کی نہیں، ایک محبت کرنے والے کی حرکت تھی۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ اتنا پست نہیں ہوا، جتنا سمجھ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ کوئی اچھا فعل نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں تو گناہ گار ہوئی تھیں اور جمیلہ کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی۔ تو اب کیا کیا جائے؟

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے وہ پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ گھر میں بند رہا۔ کہیں نہیں گیا۔ اس کے اندر کی اس تبدیلی کو سب نے محسوس کر لیا۔ جمیلہ اول تو اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ کبھی سامنا ہو جاتا تو وہ اس سے نظریں چرانے لگتا۔ اسکول کا آخری دن بھی گزر گیا۔ اگلے روز اس کی اور عمران کی روانگی تھی۔ وہ آخری رات تھی وہاں۔ اور وہ اب بھی نیند سے محروم آنکھیں لیے اس سوال کا جواب کھوج رہا تھا۔ کیا کیا جائے؟ کس طرح کفارہ ادا کیا جائے؟

وہ جانتا تھا کہ جواب اس کے سامنے ہے...... اسے معلوم ہے مگر وہ بے ایمانی کر رہا تھا۔ اس جواب سے نظریں چرا رہا تھا۔ اس میں ہمت ہی نہیں تھی کہ کچھ کرے۔ وہ صرف کفارہ ہی نہیں تھا، اسکے لیے بہت بڑا انعام بھی تھا۔ وہ پھر وہی غلطی کر رہا تھا، جو اس نے پہلے کی تھی۔ مسائل سے نظریں چرانے کی غلطی، جس کے نتیجے میں وہ غلطی پر غلطی کر رہا تھا، مگر اب کیونکہ اسے اس کا احساس تھا، اس لیے وہ لڑ سکتا تھا۔ اسے ہمت کرنا تھی اور ہر خطا کے کفارے کا راستہ ایک ہی طرف جاتا تھا...... جمیلہ سے شادی کی طرف!

جمیلہ سے شادی کر کے وہ اس رات اپنی نظروں سے گناہ اور ہاتھ کے ارادہ گناہ کا کفارہ ادا کر سکتا تھا۔

جمیلہ سے شادی کر کے وہ اس احسان کا کسی حد تک حق ادا کر سکتا تھا، جو جمیلہ نے عمران کو ممتا دے کر اس پر کیا تھا۔

جمیلہ سے شادی کر کے وہ جمیلہ کی اُس محبت کو سرخ رو کر سکتا تھا، جسے اس نے گالی دی تھی۔

جمیلہ سے شادی کر کے وہ اس زیادتی کی تلافی کر سکتا تھا، جو اُس نے جمیلہ سے کی تھی۔

جمیلہ سے شادی کر کے وہ عمران کو اُس کی امی دے سکتا تھا۔

جمیلہ سے شادی کر کے وہ اپنی زندگی کو جنت بنا سکتا تھا۔ اپنی محبت کے اظہار کا حق حاصل کر سکتا تھا۔

ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ ہر گناہ کا ایک ہی کفارہ تھا۔ ہر خطا کی ایک ہی تلافی تھی۔ اسے جمیلہ سے شادی کر لینی چاہیے۔

وہ بستر پر لیٹا سوچتا رہا لیکن کیسے؟ میں کس منہ سے بات کروں؟ کیسے سوال کروں؟

وقت نکلا جا رہا تھا۔ رات تیزی سے صبح کی طرف بڑھ رہی تھی...... اور صبح اسے عمران کو ساتھ لے کر

کراچی واپس چلے جانا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بجے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ بیٹھا۔ کفارے اور تلافی کے لیے سوالی بننے میں کیا حرج ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں اس کی سچی خوشی بھی تھی۔ دہری خوشی، عمران کے لیے اس کی امی کی اور خود اس کے لیے اپنی محبت کے حصول کی...... مکان کے گھر ہو جانے کی۔ کیونکہ ایک جمیلہ ہی تو تھی جس سے وہ شادی کر سکتا تھا۔

وہ اٹھا اور کمرے سے نکل آیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح جگائے جانے پر جمیلہ کا ردعمل کیا ہو گا۔ کیا پتا، اتنی ذلت کے بعد اب وہ انکار ہی کر دے۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اندھیرے میں ایک آواز ابھری۔ ''شاہ جی بابا......''

اور اس کے پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے!

☆☆☆☆☆

اس بار شاہ جی بابا کے قیام نے کلثوم کو مضطرب کر دیا تھا۔ شاہ جی کا انداز اسے خوف زدہ کر رہا تھا، جیسے کچھ ہونے والا ہو مگر پھر سینے کے اندر کوئی کہتا تھا...... کلثوم، تیرے آنگن میں چاند اترنے والا ہے۔ راہ تکتی رہ۔ چاند کی عزت پر داغ نہ لگے۔

یہ آخری رات تھی۔ اگلے روز شاہ جی بابا بیٹے کو لے کر واپس جا رہے تھے۔ وہ سو ہی نہیں سکی۔ کیا اندر کی وہ آواز غلط تھی؟ وہ بس یہی سوچے جا رہی تھی۔ وہ برآمدے میں کرسی ڈالے بہت بے آرام بیٹھی تھی۔ اس نے پیروں پر کمبل ڈالا ہوا تھا۔ سردی زیادہ نہیں تھی۔ اچانک ہی اس کے دل میں جیسے چاند اتر آیا۔ ہر طرف چاندنی پھیل گئی! آہٹ سنائی دی، شاہ جی بابا کے کمرے کا دروازہ کھلا، وہ باہر آیا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے قدم جمیلہ کے کمرے کی طرف اٹھتے، کلثوم نے اسے پکار لیا۔ ''شاہ جی بابا......''

روشنی اتنی تھی کہ کلثوم نے ٹھٹکے ہوئے شاہ جی بابا کو دیکھ لیا۔ وہ اٹھ کر ان کی طرف گئی

''کیا بات ہے چاچی، تم سوئیں نہیں؟'' نعمان نے پوچھا۔

''آپ جب جانے والے ہوتے ہیں تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔''

''کیوں؟''

''خدمت سے محروم ہونے والی ہوتی ہوں نا...... اس لیے۔ پھر اب تو چھوٹے بابا بھی جا رہے ہیں۔ کلثوم نے کہا۔ پھر پوچھا ''آپ کیسے اٹھے ہیں شاہ جی بابا۔''

''مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ سوچا، اٹھ کر پانی پی ہی لوں۔''

''چلیں...... میری جاگ کام آ گئی۔ آپ اپنے کمرے میں چلیں۔ میں پانی لے کر آتی ہوں۔''

نعمان بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ افسردہ تھا۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ شاید قسمت اب اسے تلافی اور کفارے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

کلثوم پانی کا گلاس لائی اور ادب سے اسے پیش کیا۔ نعمان نے پانی پی کر گلاس اسے واپس کرتے

ہوئے کہا۔ ''جزاک اللہ چاچی۔''

''شاہ جی بابا، آپ ابھی سوتو نہیں رہے؟'' کلثوم نے پوچھا۔

''نہیں...... کیا بات ہے چاچی؟''

''یونہی...... آپ کے پاس بیٹھنے، باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''ضرور بیٹھو چاچی۔''

کلثوم کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ پر ایک بات کہنا چاہتی ہوں میں۔''

''بولیں نا چاچی۔''

''سرکار جی، آپ کے پاس اللہ جی کا دیا سب کچھ ہے۔ پر جی آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں چاچی۔'' نعمان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''جان کی، شاہ جی بابا۔ جان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

نعمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ ''میں شاہ جی سرکار یہ بتا رہی ہوں کہ ہم نسلوں سے آپ کے خدمت گار لوگ ہیں۔ اور نسلوں تک آپ کے خدمت گار، نمک خوار رہیں گے۔ میرے دو بیٹے ہیں جی۔ آپ کی زمینوں پر کام کرتے اور آپ کا نمک کھاتے ہیں۔ آپ مالک اتنے اچھے کہ آپ نے انہیں زمین دار بنا دیا۔ پر اگر میرے بیٹے ہیں تو ہمیشہ آپ کے چاکر ہی رہیں گے۔ ہماری عزت پیسے، زمین سے نہیں، آپ کی خدمت سے ہے۔ سرکار جی، آپ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس جان کے سوا کچھ بھی نہیں اور عزت جو ہے، وہ آپ کی عزت کا صدقہ ہے اور میں نے کہا نا جی کہ جان کی ضرورت تو کسی بھی وقت کسی کو بھی پڑ سکتی ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں سرکار کہ کبھی سرکار کو اپنے لیے، اپنے لیے نہ سہی چھوٹے بابا کے لیے جان کی ضرورت پڑے تو منہ سے کہہ کر کبھی خود کو ہلکا نہ کریں۔ اللہ نہ کرے، سرکار کبھی منہ سے کچھ مانگ کر ہمیں شرمندہ کریں۔ ہماری تو آخرت اس میں ہے کہ سرکار کا صرف اشارہ پا کر اپنا سب کچھ قربان کر دیں اور جان کے سوا کچھ ہے ہی نہیں ہمارے پاس۔ میں یہ کہہ رہی ہوں، جب ضرورت پڑے، صرف اشارہ کر دیجئے گا۔ ہماری آخرت بھی سنور جائے گی۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی اور اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ اچانک بولی۔ ''شاہ جی بابا...... یہ جو جمیلہ ہے نا...... میری دھی...... یہ میری اور اپنے بابا کی جان ہے۔''

نعمان شاہ اس کی بے ربط گفتگو سے پریشان تھا لیکن اس کی آخری بات سن کر وہ سناٹے میں آ گیا۔ کیسی دانش مند عورت ہے۔ اس نے سوچا۔ اور کیسی روایت پرست ہے۔ اب وہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی کوئی بات، کوئی لفظ نہ بے مقصد تھا، نہ بے ربط۔ جانے کیسے، اس نے سب کچھ سمجھ لیا تھا اور اب اسے ہلکا ہونے سے بچانے کے لیے اپنی آن قربان کر رہی تھی۔ اُس کی عزت کے لیے اپنی عزت سے دست بردار ہو رہی تھی۔

''سرکار جی...... کوئی ایسی ویسی بات مت سوچئے گا۔ ہم جہاں ہیں، اس سے اوپر جانا بھی نہیں چاہتے۔ اپنی جان دے دیں گے اور پھر قدموں میں بھی نہیں بیٹھیں گے۔ اور نیچے چلے جائیں گے اور شاہ جی بابا، دنیا کی بھی پرواہ نہ کیجئے گا۔ میں تو ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ ہم نیچ لوگ ہیں۔ ہمیں مالکوں کے آگے جھولی پھیلا کر قدموں میں بیٹھنا بھی آتا ہے اور منہ پھاڑ کر مانگنا بھی اور ہم جو چاہیں، لے ہی مرتے ہیں۔'' وہ بدستور اسے تکے جا رہی تھی۔ ''بس سرکار جی، ضرورت ہو تو منہ سے کچھ نہ کہیے گا۔ آنکھ کا اشارہ کر دیجئے گا۔''

نعمان شاہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ لمحے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے۔ وہ غور کر رہا تھا کہ وہ کتنا چھوٹا ہے اور یہ لوگ کتنے بڑے۔ جو کچھ اسے کہنا تھا، وہ اس جاہل عورت نے سمجھ لیا اور خود ہی کہہ بھی دیا اور وہ اب ہیرو بھی بنا رہے گا اور اسے من کی مراد بھی مل جائے گی لیکن وہ کفارہ تو نہیں ہوگا۔ تلافی تو نہیں ہوگی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک لمحے کو کلثوم کو دیکھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ ایسی صورت حال کا شکار ہوا تھا۔ نعمان نے فوراً ہی نظر نیچی کر لی۔ ''نہیں چاچی، جب کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ چیز عزیز بھی ہو اور قیمتی بھی، تو اسے آن کی قیمت پر ہی خریدا جاتا ہے۔ اسے عاجزی سے، گڑگڑا کر مانگا جاتا ہے۔ صدیوں کا حق سمجھ کر نہیں طلب کیا جاتا۔'' وہ رکا، اس نے گہری سانس لی اور نظر نیچی کیے کیے کہا۔ ''ہاں چاچی، میں تم سے تمہاری جان مانگ رہا ہوں۔ چاچی، جمیلہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ مجھے ضرورت ہے اُس کی۔''

کلثوم نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ پھر وہ اٹھی۔ ''میں ابھی آتی ہوں شاہ جی سرکار۔'' اور کمرے سے چلی گئی۔ دو منٹ بعد وہ آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک طشتری تھی۔

''یہ لیں شاہ جی بابا...... منہ میٹھا کریں۔'' اُس نے مٹھائی اس کی طرف بڑھائی۔

نعمان شاہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اُس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ''ضرور لوں گا مٹھائی مگر میری دو شرطیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ کلثوم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''ایک تو مٹھائی آپ مجھے اپنے ہاتھ سے کھلائیں گی۔ دوسرے اب آپ میرا نام لیں گی۔ یہ شاہ جی بابا نہیں چلے گا۔ نعمان شاہ کہیں مجھے۔''

کلثوم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''یہ دوسری شرط مشکل ہے شاہ جی لیکن آپ کا حکم سمجھ کر اسے پورا کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ برسوں کی عادی زبان کو گستاخی کا عادی ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ شاید برسوں لگ جائیں۔ اب آپ مٹھائی کھا لیں میرے ہاتھ سے۔''

جواباً نعمان شاہ نے اسے اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائی۔

''آپ حکم کریں۔ تاریخ بتائیں مجھے۔'' کلثوم نے کہا۔

''تاریخ ہوگی ۲۷ دسمبر اور آپ کو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر نعمان اسے تفصیل سمجھاتا رہا۔ کلثوم سر ہلاتی رہی۔ آخر میں نعمان شاہ نے کہا۔ ''یہ سب کچھ بابا کو اور آپ کو ویسے ہی کرنا ہے ماں، جیسے میں نے کہا۔''

کلثوم کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے نعمان کو دیکھتی رہی۔ ''ہاں ماں۔ اب تم میرے لیے ماں ہو۔ میں بھی عمر بھر ماں کو ترستا رہا۔ اب میرے بیٹے کو امی مل گئی ہے تو میں ماں سے کیوں محروم رہوں۔''

کلثوم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ برسوں...... برسوں پہلے اس نے نعمان شاہ کے باپ کی...... چاند کھلونے کی آرزو......آرزو نہیں ضد کی تھی لیکن اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ پھر اس نے بیٹی کے لیے چاند کھلونے کی صرف آرزو نہیں کی، دعائیں بھی کیں۔ اللہ نے اس کی دعا سن لی۔ بیٹی کے آنگن چاند اتر آیا اور انعام اسے بھی مل گیا۔ چاند تو اب اسے نہیں مل سکتا تھا مگر اس کے اندھیرے دل میں چاندنی کھیت کر گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

عمران کو لگ رہا تھا کہ وہ کسی اجنبی دنیا میں آ گیا ہے۔ وہ کراچی سے گیا تو چار سال کا تھا اور اب وہ دس سال کا واپس آیا تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ناخوش تھا۔ اُس روز اس نے سن لیا تھا کہ پاپا کس طرح امی کو ڈانٹ رہے ہیں...... برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ اس کا دل بہت دکھا تھا امی کے لیے۔ اب وہ سمجھ دار لڑکا تھا۔ بہت کچھ جان گیا تھا۔ بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ جمیلہ کے ایثار اور محبت کی جڑیں اس کے وجود میں بہت گہری تھیں۔ وہ اس کے لیے سچ مچ کی امی تھی لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ دنیا کی نظروں میں وہ اس کی امی نہیں۔ اسی لیے اس نے شروع ہی میں اس پر پابندی لگائی تھی کہ وہ صرف اکیلے میں امی کہا کرے۔ اب وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ پاپا جمیلہ کو اس کی سچ مچ کی امی بنا سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ امی نہیں تھی اس کی۔ بس اس کا دل مچلتا تھا کہ وہ سب کے سامنے اسے امی کہے اور بار بار کہے لیکن پاپا نے تو الٹا امی کو ذلیل کر دیا تھا اور اسے کراچی لے آئے۔

اور اب اسے ہر لمحے امی کی یاد ستاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اس گھر کے مقابلے میں یہ شہر بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ یہاں تو وقت گزارنا بھی مشکل تھا۔ بس اس نے ایک لائبریری پکڑ لی تھی اور وہاں سے کہانیوں کی کتابیں لا لا کر پڑھ رہا تھا۔

نعمان اُس کی کیفیت، اس کا کرب سمجھ رہا تھا۔ کبھی وہ سوچتا کہ اسے سب کچھ بتا دے مگر پھر سوچتا کہ اس کی خوشی کم ہو جائے گی۔ اتنے دن دکھ اٹھانے کا انعام بھی تو بہت خوبصورت ہوگا اور پھر دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ ۲ دسمبر کو وہ کراچی پہنچے تھے۔ آج ۹ تاریخ تھی اور نعمان کا ارادہ ۲۰ تاریخ تک ایبٹ آباد پہنچنے کا تھا۔ اس نے ایبٹ آباد میں جو مزید ایک دن گزارا تھا، اس میں تمام انتظامات کر لیے تھے۔ ایک ماہ کے لیے ایک بنگلا کرائے پر لیا گیا تھا، جس میں شادی ہونا تھی۔ وہ دو منزلہ بنگلا تھا۔ اوپری منزل پر شادی تک دلہن والوں کو ٹھہرنا تھا۔ نچلی منزل دولہا والوں کی تھی۔ شادی کارڈ چھپنے کو دے دیے گئے تھے۔ ان کی تقسیم صابر شاہ کے ذمے تھی۔ ویسے بھی مدعوئین کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ نعمان نے صرف صابر شاہ، محمود خان اور اپنے کارخانے کے اسٹاف کو مدعو کیا تھا۔ تمام انتظامات صابر شاہ اور محمود خان کو کرنے تھے۔

''بیٹے...... میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا یہاں دل نہیں لگ رہا ہے۔'' نعمان نے بیٹے سے کہا۔

''ایسی بات نہیں پاپا۔ اب میری دل وہاں بھی نہیں لگے گا۔'' عمران نے جواب دیا۔

نعمان دیکھ رہا تھا کہ عمران اُس سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ ''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نے امی کی بہت بے عزتی کی تھی۔ اب میں کیسے ان کے سامنے جاؤں گا۔''

عمران نے جمیلہ سے اس کی وہ ذلیل گفتگو سن لی ہوگی اور عمران نے پہلی بار اس کے سامنے جمیلہ کو امی کہا تھا۔ سوچ سمجھ کر...... یہ انداز باغیانہ تھا۔ ''چلو...... اچھا ہی ہے...... اب تم جمیلہ کو بھول جاؤ۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

عمران خاموش رہا۔

''تمہارا دل نہیں چاہ رہا تھا تو میرے ساتھ کیوں آئے؟''

''امی نے ہمیشہ مجھ سے ایک بات کہی۔ سب کچھ پاپا سے ہے۔ پاپا کی ہر بات مانو۔ جب تک پاپا کی بات مانو گے، میں تمہاری امی ہوں۔ نہیں مانو گے تو امی نہیں رہوں گی۔''

نعمان شاہ کو جمیلہ پر پیار آ گیا۔ تربیت اور کسے کہتے ہیں۔ ''تو پھر میری یہ بات بھی مانو، جمیلہ کو بھول جاؤ۔''

''میں آپ کی ہر بات ماننے کی کوشش کرتا ہوں پاپا لیکن امی کو بھولنا...... پاپا، وہ سچ مچ میری امی ہیں۔'' عمران کی آواز بکھرنے لگی۔ وہ پلٹا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نعمان نے بڑی مشکل سے خود کو روکا۔ ورنہ وہ عمران کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا

اُس رات وہ سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے جگا دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ دو بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو......''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ وہ ریسیور رکھنے والا تھا کہ جمیلہ کی آواز سنائی دی۔ ''سرکار جی...... سلام علیکم۔''

اسے حیرت ہوئی۔ ''کیا بات ہے جمیلہ؟''

''میں نے تو آپ سے معافی مانگی تھی سرکار جی۔ دل سے معافی مانگی تھی پر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''بات کیا ہے جمیلہ؟''

''آپ یہاں میری شادی کا حکم دے کر گئے ہیں۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

''تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میرا خیال ہے، تم میرا کوئی حکم نہیں ٹال سکتیں۔''

''یہ سچ ہے میرے سرکار لیکن شادی کے معاملے میں مجبور ہوں۔''

''کیا مجبوری ہے؟''

''ایک وعدہ ہے، جو میں نے کسی سے کیا تھا۔ ایک قسم ہے، جو نہیں توڑ سکتی۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں، آپ کو آئندہ میری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''یہ شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی جمیلہ۔'' نعمان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں اپنی قسم دیتا ہوں۔ یہ شادی تمہیں کرنی ہے۔''

''اب تو مجبوری ہے میرے سرکار۔'' جمیلہ کی آواز رندھ گئی۔

''میں دونوں میں سے ایک قسم بھی نہیں توڑ سکتی۔ کیا کروں، میں مر ہی سکتی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

ضدی لڑکی، کہیں کچھ کر ہی نہ بیٹھے۔ اس نے کریڈل دبایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ فوراً ہی مل گیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی...... بجے جا رہی تھی لیکن جمیلہ ریسیور نہیں اٹھا رہی تھی۔ نعمان نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا، جو لرز رہے تھے۔ وہ اس رابطے کو منقطع کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس وقت اُس کی دھڑکنیں، اس کا رواں رواں دعا کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ جمیلہ تکیے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ دکھ اور آزمائش اُس کے ظرف سے بہت بڑی تھی۔ وہ کیا کرے۔ اُس نے عمران سے وعدہ کیا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ وہ ہمیشہ صرف اس کی امی رہے گی اور اب سرکار جی نے اپنی قسم دے دی تھی کہ وہ قسم توڑ دی جائے۔ وہ کیا کرے؟ صرف موت ہی اس مسئلے کا حل ہے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ فون کی گھنٹی دیر سے بج رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شاہ جی سرکار کا فون ہے۔ لیکن کیا فائدہ بات کرنے کو اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ گستاخی ہے۔ آخری وقت میں کیوں ایسی گستاخی کی جائے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

''جمیلہ...... جمیلہ...... تم ٹھیک تو ہو نا؟ شکر ہے تم نے ریسیور تو اٹھایا۔'' دوسری طرف سے نعمان شاہ مضطرب لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جمیلہ کو حیرت ہوئی کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے۔

''تم بولتی کیوں نہیں جمیلہ۔ ٹھیک تو ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں جی۔ لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، کوئی حماقت نہ کرنا۔ میری قسم سے تمہاری کوئی قسم نہیں ٹوٹے گی۔'' وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ سنو جمیلہ، اپنا خیال رکھو۔ میں تمہیں اچانک خوشی دینا چاہتا تھا۔ اس لیے نہیں بتایا۔ تمہاری شادی عمران کے پاپا سے ہو رہی ہے۔ تم عمران کی امی بن رہی ہو......''

جمیلہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ وہ کیسے یقین کر لے۔ میز سے جھولتے ہوئے ریسیور سے نعمان شاہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔

جمیلہ نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا لیا۔

''جمیلہ...... جمیلہ...... تم سن رہی ہو نا؟''

''جی......'' جمیلہ نے بمشکل کہا۔ وہ خود کو عالمِ خواب میں محسوس کر رہی تھی۔

''سنو جمیلہ...... عمران کو آخر تک پتا نہ چلے۔ تم اس کی سالگرہ کا تحفہ ہو۔''

''جی......''

''اور سنو...... یہ شاہ جی، سرکار جی اور بابا جی، اب نہیں چلے گا۔ کوئی ڈھنگ کا خطاب ڈھونڈو میرے لیے......''

اچانک جمیلہ پر حیا طاری ہو گئی۔ ''خدا حافظ'' اس نے کہا اور کسی نے اس کے کندھوں کو نرمی سے چھوا۔ وہ اچھل پڑی۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کلثوم تھی۔ ''ماں...... کیا یہ سچ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

کلثوم نے جو مسلسل گھنٹی کی آواز سے جاگ گئی تھی اور کمرے میں چلی آئی تھی، اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ماں......'' جمیلہ نے اس کی گود میں منہ چھپا لیا۔

کلثوم اسے تھپتھپاتی رہی۔ ''ہاں دھیئے، میں نے کہا تھا نا کہ چاند کے لیے صرف دعا کر سکتے ہیں۔ خدا نے دعا سن لی۔ چاند نے تجھے گھر کے لیے جگہ دے دی میری نصیبوں والی......''

☆☆☆☆☆

عمران نے ایبٹ آباد جانے میں بھی دل چسپی نہیں لی تھی اور ایبٹ آباد پہنچ کر بھی وہ خوش نہیں تھا۔

''میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ تمہیں سالگرہ پر یادگار تحفہ دوں۔'' نعمان نے اُس سے کہا تھا۔

عمران نے بے پروائی سے کہا۔ ''پاپا...... وہ طوفان والا تحفہ میرے لیے بہت ہے۔ اب مجھے کوئی تحفہ نہیں چاہیے۔''

''یار بیٹے...... تحفہ میں تمہیں اس بار یادگار دوں گا۔ ایسا کہ تم طوفان کو بھی بھول جاؤ گے۔''

عمران اسے متجسس نظروں سے دیکھتا رہا لیکن اس نے پوچھا کچھ نہیں۔

''میں تمہیں اس بار سچ مچ کی امی دوں گا تحفے میں۔''

''پاپا...... امی کی مجھے ضرورت نہیں۔ میری امی موجود ہیں۔'' عمران نے سرد لہجے میں کہا۔

''وہ سچ مچ کی امی نہیں۔ اس بار جو میں تمہیں دوں گا، وہ تمہاری سچ مچ کی ماں ہو گی۔'' نعمان نے اسے غور سے دیکھا۔ ''بیٹے...... ڈونٹ یو لو می؟''

''آئی لو یو پاپا...... آئی ٹرولی لو یو۔''

''تو بیٹے، میری خوشی میں تمہیں خوش ہونا چاہیے۔''

''میں خوش ہوں پاپا۔ بہت خوش ہوں۔''

''اچھا بیٹے...... ایک بات سنو۔ یہ اوپر والے حصے میں کبھی نہ جانا۔ وہاں تمہاری ہونے والی امی رہتی ہیں۔''

''نہیں جاؤں گا پاپا۔'' عمران نے کہا مگر اس کا انداز ایسا تھا، جیسے کہہ رہا ہو کہ اب تو میرے وہاں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ باپ بیٹے مل کر شاپنگ کرتے رہے۔ زیورات، کپڑے اور نجانے کیا کیا لیکن عمران خوش نہیں تھا۔ نعمان نے اس کے لیے بہت شاندار سوٹ سلوایا تھا۔

اگلے روز عمران کی رب نواز سے ملاقات ہو گئی۔ ''چاچا جی...... آپ یہاں؟''

''ہاں نکے شاہ جی۔ شاہ جی بابا کی شادی جو ہے۔ اس میں ہاتھ بٹانا ہے۔ سب یہیں آئے ہوئے ہیں۔ ریاض بھی، نواز بھی۔''

عمران اُس سے جمیلہ کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ پاپا کے سامنے تو وہ اب جمیلہ کو امی کہنے لگا تھا۔ کیونکہ بات کھل گئی تھی لیکن چاچا اور چاچی کے سامنے وہ ہچکچا رہا تھا۔ اس نے سوچا، یہ بات امی کو اچھی

نہیں لگے گی۔" چاچی...... باجی بھی آئی ہوئی ہیں نا؟ مجھے ان سے ملوادیں۔"

"ننکے شاہ جی...... ہم نے بہت کہا۔ پر جمیلہ آئی ہی نہیں۔ وہ اپنے چاچا کے گھر رہنے چلی گئی۔"

عمران اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کا دل دکھنے لگا جمیلہ کے لیے۔ ساتھ ہی پاپا پر غصہ بھی آنے لگا۔ اس نے سوچا، کاش میں بھی اس موقع پر کسی کے ہاں رہنے جاسکتا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تمہاری ہونے والی امی کیسی ہے؟" کلثوم نے کہا۔

"کیسی ہیں وہ؟" عمران نے بے دلی سے پوچھا۔

"بہت اچھی، بہت پیاری۔ ایسی کہ تم دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

عمران نے دل میں کہا...... میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا...... اور میں خوش بھی نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆☆☆

شادی کا دن آ گیا۔ عمران کا عجب حال تھا۔ اس نے سوٹ پہنا تھا اور وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بار بار مسکرانے کی کوشش کرتا لیکن اُس کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔ وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔ اُس کے دل میں ایک دکھ کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ پاپا نے اس کام کے لیے میری سالگرہ کے دن کا انتخاب کیوں کیا۔ یہ ہے میری سالگرہ کا تحفہ...... مجھ سے میری امّی چھین لی پاپا نے۔ یہ ہے سالگرہ کا یادگار تحفہ۔

نکاح کے لیے صبح دس بجے کا وقت مقرر ہوا۔ پونے دس بجے صابر شاہ قاضی صاحب کو لے آیا۔ نکاح کے فارم پُر کیے جانے لگے۔ عین موقع پر محمود خان، پروگرام کے مطابق عمران کو ایک طرف لے گیا۔

"چھوٹے شاہ جی، آج سے آپ طوفان کے پورے مالک بن رہے ہیں۔" اُس نے سرگوشی میں کہا۔

دل کا رنج اتنا بڑا تھا کہ عمران کو اس کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے محمود خان کو دیکھتا رہا۔

"طوفان کو میں صبح ہی آپ کے گھر پہنچا آیا ہوں۔"

"میرے گھر؟"

"جی ہاں۔ جا کر دیکھ لیجیے گا۔"

اتنی دیر میں قاضی صاحب نعمان شاہ سے 'قبول ہے' کہلوا چکے تھے۔ گیارہ بجے رخصتی کا وقت آ گیا۔

نعمان شاہ نے عمران سے کہا۔ "بیٹے...... تم چل کر جیپ میں بیٹھو۔ میں تمہاری امی کو لے کر آتا ہوں۔"

"جی اچھا پاپا۔" عمران نے بجھے بجھے لہجے میں کہا اور جیپ کی طرف چل دیا۔

دس منٹ بعد نعمان شاہ دلہن کو لے کر جیپ کی طرف آیا۔ سب لوگ انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ کلثوم دلہن کو کلام پاک کے سائے میں گھر سے باہر لائی تھی۔ پھر ریاض اور نیاز اسے سہارا دے کر لائے تھے۔

نعمان نے جیپ میں بیٹھے عمران کو دیکھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دل گرفتگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ نعمان کا دل کٹنے لگا لیکن اب بس چند منٹ کی تو بات تھی۔ "بیٹے...... تم وہاں کہاں بیٹھے ہو۔" اُس نے عمران سے کہا۔ "نیچے آؤ...... تمہیں اگلی سیٹ پر بیٹھنا ہے...... میرے اور اپنی امی کے درمیان۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں پاپا۔" عمران منمنایا۔

"میری بات نہیں مانو گے۔"

"آپ کی بات تو مانتا ہوں پاپا۔" عمران نے روہانسا ہو کر کہا اور نیچے اتر آیا۔

نعمان شاہ نے دروازہ کھولا اور اس سے کہا۔ "چلو...... بیٹھو۔ اسطرف ہو جاؤ۔" عمران کے بیٹھنے کے بعد اس نے سہارا دے کر دلہن کو جیپ میں بٹھایا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ گھوم کر دوسری طرف آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

لوگ ہاتھ ہلاتے رہے۔ جیپ چل پڑی۔ پاپا کے جیپ ہلکے چلانے سے بھی اسے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس ڈرامے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"پاپا...... ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے گھر۔"

عمران کو حیرت ہوئی۔ محمود خان نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔

"لیکن پاپا...... میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"چلو...... گھر تو دیکھ لو اپنا۔ پھر جو تم کہو گے، وہی کریں گے۔" نعمان نے محبت سے کہا۔

اب جیپ پہاڑی راستے پر چل رہی تھی۔ راستہ نیا بنا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ کبھی کسی زاویے سے پہاڑی کی چوٹی پر بنا وہ خوبصورت بنگلا نظر آ جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر عمران کو خیال آتا کہ کاش اس کا بھی ایسا ہی گھر ہوتا۔

جیپ اب بالکل اوپر پہنچ چکی تھی۔ آخری موڑ مڑتے ہی وہ بنگلا سامنے نظر آیا۔ راستہ بنگلے کے گیٹ پر ختم ہو رہا تھا۔ عمران کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا یہی میرا گھر ہے؟ اُس نے سوچا۔

اور اسی لمحے جیپ گیٹ کے سامنے رک گئی۔ نعمان عمران کی طرف مڑا۔ "گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم گھونگھٹ اٹھا کر اپنی سچ مچ کی امی کا چہرہ دیکھو۔"

عمران نے اسے حیرت سے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر ضد کا تاثر ابھرا۔ "نہیں پاپا۔"

"یہ میرا حکم ہے عمران۔"

"پلیز پاپا......"

"میری نافرمانی کرو گے تو تمہاری امّی تمہاری امّی نہیں رہے گی۔"

عمران نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ پھر گھوم کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ گھونگھٹ اٹھتے ہی وہ پاگل ہو گیا۔ "امی...... امی...... یہ آپ ہیں۔ سچ مچ آپ ہی ہیں نا۔" وہ رو بھی رہا تھا...... ہنس بھی رہا تھا۔ "امی...... کیا یہ سچ ہے۔" پھر وہ اس سے لپٹ کر اسے چومنے لگا۔

"یار بیٹے...... یہ فاؤل ہے۔" نعمان نے احتجاج کیا اور جمیلہ گلنار ہو گئی۔

"تھینک یُو پاپا۔" عمران نے پلٹ کر نعمان سے کہا اور پھر جمیلہ سے لپٹ گیا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو عمران......" نعمان نے گانا شروع کیا۔ جمیلہ بھی دھیمی آواز میں آواز ملانے لگی۔

پھر نعمان نے عمران کو کھینچا۔ ''بس ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ اب باقی ڈراما گھر میں کر لینا۔ اب نیچے اترو۔ یہ امّی تمہاری سالگرہ کا پہلا تحفہ ہے اور یہ گھر دوسرا۔ یہ چابی لو اور دروازہ کھولو۔

وہ جدید طرز کا بنگلا تھا۔ سامنے بہت بڑا لان تھا۔ اصطبل کے سامنے پہاڑی ڈھلان پر اتنا بڑا لان تھا کہ وہاں گھڑ سواری بھی کی جا سکتی تھی۔

عمران کو اپنا کمرا اور اس کی آرائش بہت اچھی لگی۔ وہ نعمان سے لپٹ کر اسے پیار کیے جا رہا تھا اور تھینک یو پاپا...... آئی لو یو پاپا کی گردان کیے جا رہا تھا۔ پھر اس کی نظر جو نعمان پر پڑی تو وہ ہنسنے لگا۔

''پاپا...... پتا ہے۔ آپ دلہن بن گئے ہیں۔''

نعمان بوکھلا گیا۔ جمیلہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا اور ہنسنے لگی۔ عمران نے پہلے اسے پیار کیا تھا اور اس کے رنگ چرائے تھے۔ پھر نعمان کو پیار کیا تھا اور چرائے ہوئے رنگ اس کے چہرے پر سجا دیے تھے۔

☆☆☆☆☆

عمران سو چکا تھا۔ اور بہت خوش سویا تھا! نعمان اور جمیلہ اب اپنے کمرے میں تھے...... حجلۂ عروسی میں۔

''جمیلہ، میں نے تم سے صرف عمران کے لیے شادی کی ہے۔ اس میں تمہیں توہین محسوس نہیں ہوتی۔''

''عزت کو توہین کون کہہ سکتا ہے صاحب۔ اگر آپ صرف عمران کے لیے بھی کرتے تو میری خوشی کم نہ ہوتی۔'' جمیلہ نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ صرف عمران کی بات نہیں۔ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں بہت خوش نصیب ہوں صاحب۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''بس معلوم ہے۔ دل کی بات دل کو معلوم ہو جاتی ہے۔'' جمیلہ نے کہا۔ وہ اس رات کا حوالہ دے کر اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''پھر بھی۔''

جمیلہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''دیکھیں صاحب، محبت نہ کرتے تو اپنے درخت کا پہلا پھل مجھے کیوں کھلاتے۔''

''تمہاری سمجھداری کا تو میں قائل ہوں۔''

''اب میں پڑھی لکھی بھی ہو جاؤں گی۔ جانتے ہیں، عمران کے ساتھ ساتھ پڑھتی رہی ہوں۔ وہ فرسٹ آیا ہے تو سمجھ لیں، میں بھی فرسٹ آئی ہوں۔ دیکھیں صاحب، آپ مجھے جو کچھ بنانا چاہیں گے، میں ویسی ہی بن جاؤں گی۔ آپ جیسا دیکھنا چاہیں گے، میں ویسی ہی نظر آؤں گی۔''

''اور یہ شاہ جی، سرکار جی اور بابا جی کا متبادل صاحب ڈھونڈا ہے تم نے؟''

''جی صاحب۔''

''غنیمت ہے۔ بابا جی سے تو بہتر ہے۔''

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ملن کی رات کا آغاز ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆